نمک مرچ



شوکت تھانوی

نمک مرچ

شوکت تھانوی

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

ناشر ——— محمد طفیل
مطبع ——— نقوش پریس
قیمت ——— پانچ روپے پچاس پیسے

فہرست

دولت خانہ

میں ابھی بستر کی چارپائی کر بستر کا پان کھانے کے لیے بیگم کو پان کھانے کی طرف متوجہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور مجبوراً اسی حالت میں باہر آنا پڑا باہر نکل کر دیکھا کہ ریاض کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر لپٹتے ہوئے کہا۔

"ارے ریاض۔ کمال کر دیا تو نے یعنی تم مرے نہیں"

بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے اور جب جالندھر کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہوا تو اس حملے کے بعد جتنے ساتھی نظر نہ آئے ان سب کے متعلق یہ طے کر لیا تھا کہ شہید ہو چکے ہونگے بلکہ لاہور پہنچ کر اس ریاض کی تو غائبانہ نماز جنازہ تک شریک ہو چکے تھے مگر ریاض زندہ سلامت کھڑا ہوا مزے سے سگرٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

اب یہیں کھڑے کھڑے محبت بگھارو گے یا گھر میں بھی لے چلو گے۔

میں نے گھبرا کر کہا "گھرا ... ہاں ٹھیک ہے یہ گھر ہی تو ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو" اور دروازے کے اندر جھانک کر کہا "سنتی ہو ریاض آگیا ہے ذرا پردہ کرلو۔ اندر ہی بلالیں"۔

ایک منٹ میں پردہ ہوگیا اور ریاض کو میں نے ڈرائینگ روم میں بلالیا ریاض نے اندر داخل ہوکر چاروں طرف وحشت سے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب یعنی بس۔ صرف ایک دروازے کی کوٹھڑی جس میں صرف ایک چارپائی آسکتی ہے تم اس میں رہتے کس طرح ہو؟ اور یہ جو تم نے بھابی کو پردہ کرنے کو کہا ہے وہ آخر گئیں کہاں اور کس دروازے سے گئیں مجھ کو تو صرف ایک دروازہ نظر آرہا ہے جس سے میں داخل ہوا ہوں"۔

میں نے کہا "ہاں دروازہ تو اتفاق سے ایک ہی ہے....."

ریاض نے ایک اور دروازہ دیکھتے ہوئے کہا "اچھا یہ ہوگا اندر جانے کا دروازہ"۔

اس کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے عرض کیا "جی نہیں یہ الماری ہے اور الماری کھول کر ریاض کو دکھادی جس میں تین تختے لگے ہوئے تھے۔ ریاض نے پاگل ہوجانے کے قریب ہوتے ہوئے کہا "ارے بھائی تو بھابی کہاں سماگئیں"!

اب میں نے اس معمے کے حل کرنے میں دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ میں ریاض کے حالات معلوم کرنے کے لیے بے صبر ہو رہا تھا میں نے کہا۔

"میاں مبارک باد دو مجھ کو کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے ورنہ قسم سے کسی فٹ پاتھ پر ملاقات نہیں ہوتی جہاں تمہاری بھابی کو تم سے پردہ بھی نہ کرا سکتا. خوش نصیب ہوں میں کہ خانہ بدوش نہ بنا اور شکر ہے اُس پروردگار کا جو خود لامکاں ہے مگر مجھے مکان دے دیا۔"

ریاض نے جل کر کہا "عجب آدمی ہیں کہ آپ بھی اسے مکان کہہ رہے ہیں۔" نہایت اطمینان سے کہا "ہاں میں نے اپنی ضرورتوں کو اس کوٹھڑی میں سمیٹ لیا ہے ایک بیوی تین بچے اور پانچواں میں خود، سب نہایت اطمینان سے اس میں رہتے ہیں یہی میرا ڈرائنگ روم ہے یہی میرا بیڈ روم ہے. یہی میرا آفس روم ہے یہی میری لائبریری ہے. یہی کھانے کا کمرہ ہے اور یہی کھانا پکانے کا کمرا" اور پھر میں نے ذرا پکار کر کہا "ارے بھئی میں نے کہا "ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو ذرا پاندان بھیج دینا" اس پر ریاض نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا کہ یہ آواز سننے والی آخر کہاں ہو سکتی ہے. آخر اس نے واقعی پریشان ہو کر پوچھا "بھابی آخر ہیں کدھر؟"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا "یہیں ہیں اور کہاں ہوتیں" ؎

عفو کیا جلوۂ رحمت بھی نکھرے گا یہی
ذوقِ عصیاں حجاب ہے عرفانِ عصیاں حجاب ہے"

ریاض کو غالباً یہ شعر قطعاً پسند نہ آیا. اس نے ذرا تلخی سے کہا "یہ آخر معمہ کیا ہے بتاتے کیوں نہیں صاف صاف؟"

میں نے کہا "بھئی میرے کہہ چکا ہوں تم سے بس یہی اتنی سی جگہ ہے اسی میں اپنی تمام ضرورتیں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ یہ الماری دیکھ رہے ہو اس کے تینوں تختوں پر تینوں بھتیجے سوتے ہیں تمہارے، رات کو اوپر والے خانے میں بڑا بچہ درمیانی تختے پر منجھلا، نیچے چھوٹا جو انبالہ میں پیدا ہوا تھا۔"

ریاض نے حیرت سے کہا "کہاں ہے یعنی اس الماری میں۔ ارے بھائی اس میں تو ٹانگیں بھی نہ پھیلاتے ہوں گے یہ بچے۔"

میں نے کہا "ٹانگیں پھیلانا یا سمٹتے رہنا سب عادت پر منحصر ہے۔ اب ان کو ٹانگیں سمیٹ کر سونے کی عادت پڑ گئی ہے اور ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی صبح اُٹھنے کے بعد ٹانگیں پھیلانے بیٹھتے ہیں وہ مثل تو تم نے سنی ہو گی کہ چادر دیکھ پیر پھیلائے جاتے ہیں۔ میں نے اس میں بس ذرا سی ترمیم کر دی ہے کہ الماری کو دیکھ کر پیر پھیلانا میرے بچو۔"

ریاض نے ہکا بکا ہو کر کہا "بچے نہ ہوئے اچار کا مرتبان ہو گئے۔ شربت کی بوتلیں ہو گئے کہ الماری میں رکھے جاتے ہیں اور بھابی اس وقت کس الماری میں ہیں۔؟"

اور یہ کہہ کر وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر سخت وحشت برس رہی تھی۔ وہ وحشت جو اچانک کرنٹ لگ جانے سے کسی پر برس سکتی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں خود گھبرا گیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اور جلدی سے پوچھا کیا ہوا۔

اس نے سہمے ہوئے انداز سے پلنگ کو گھورتے ہوئے کہا "یہ اچھلا تھا

جیسے کسی نے ٹھوکا دیا ہو جیسے اور میں نے ہنس کر کہا " لاحول ولا قوۃ وہ بھی ہوں گی کہ میں ادھر بیٹھا ہوں " اور پھر پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر خاصدان لے لیا۔ ریاض آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھتا رہا جیسے اُسے سکتہ ہو گیا۔ جب میں نے خاصدان کھول کر پان اُس کی طرف بڑھائے اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا،

تو کیا بھابی پلنگ کے نیچے ہیں ؟

میں نے کہا " جب کوئی آجاتا ہے وہ پلنگ کے نیچے پردے میں چلی جاتی ہیں کافی اونچا پلنگ ہے اور اس کے نیچے دری بچھی ہوتی ہے۔ چاروں طرف چادر لٹک رہی ہے اچھا خاصا محل ہے "

ریاض نے حیرت کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا " لاحول ولا قوۃ چلو باہر چلیں یہ کیا بیہودگی ہے کہ ان کے سر پر سوار بیٹھے ہیں "

بیگم نے پلنگ کے نیچے سے فرمایا " نہیں بھائی صاحب آپ تشریف رکھیے یہ تو خانہ بے تکلف ہے یہاں ان باتوں کا خیال چھوڑ دینا پڑتا ہے "

اور میں نے بھی ریاض کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا " بھیا وہ عادی ہو چکی ہیں۔ آج یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے احباب آخر آتے ہی رہتے ہیں۔ دوسرے وہ نہایت آرام سے بیٹھی ہوں گی اس پلنگ کے نیچے دری ہے چادر ہے ایک گاؤ تکیہ ہے پورے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں جب تک ہم لوگ بیٹھے رہیں گے وہ مزے سے چھالیہ کترتی رہیں گی "

ریاض کی حیرت کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہنے لگا " صاحب عجیب

عمل زندگی ہے الماری میں بچے پلنگ کے نیچے بیوی ایک دو کی قبر نما کوٹھری اور
اسی میں ساری کائنات"۔

میں نے کہا "توبہ کرو ریاض توبہ کرو۔" یہ بڑا الول ہے میں تو بخدا اس پہ ناز
کرتا ہوں۔ اور میرے دوست میری قسمت پہ رشک کرتے ہیں کہ مجھے یہ کوٹھڑی
مل گئی ہے وہ جو گوشۂ عافیت سنتے آئے تھے اب پتہ چلا ہے کہ وہ دراصل
یہی کوٹھڑی ہے اب ذرا اس کوٹھڑی کا پروگرام سن لو رات کو جیسا کہ میں کہہ
چکا ہوں تینوں بچے احتیاط سے الماری میں رکھ دیئے جاتے ہیں اور ہم
دونوں میاں بیوی اسی پلنگ پر اس طرح لیٹ جاتے ہیں جس طرح جوتے کے
ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ادھر پنجہ ادھر دوسرے کی
ایڑی اُدھر پنجہ ادھر صبح اٹھ کر دیکھو کمرے میں ایک انگیٹھی رکھی ہے اس
پر بیگم چائے بناتی ہیں اور بڑا بچہ الماری کے اوپر والے خانے سے نکل کر دودھ
لے آتا ہے پھر سب مل کر چائے پیتے ہیں اور بچے رات کا بچا ہوا کھا کر اسکول
چلے جاتے ہیں صرف چھوٹا بچہ رہ جاتا ہے اس کے بعد بیگم برقعہ اوڑھ کر اور
بچے کو گود میں لے نکل جاتی ہیں اس لیے کہ ان کا خیال یہ ہے کہ مجھے "دراصل
گوشت کی پہچان ہے نہ میں ترکاری ٹھیک لا سکتا ہوں اس موقع کو غنیمت
جان کر اس پلنگ کو کھڑا کر دیتا ہوں فرش سمیٹ لیتا ہوں اور نلکے سے
ایک بالٹی پانی لا کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور جھاڑو ہاتھ میں لیکر غسل شروع کر دیا"
ریاض نے ٹوکا" جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل؟"

میں نے کہا صاحب غسل کا غسل صفائی کی صفائی یعنی اپنی بھی صفائی اور کوٹھڑی کی بھی صفائی نہاتا جاتا ہوں اور جھاڑو دیتا جاتا ہوں۔ پھر یہ جو میز تم کو نظر آ رہی ہے نا یہ بے نقاب ہو جاتی ہے اس کا سامان اٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہوں اور میز ہٹاتا ہوں تو تلے اوپر رکھے ہوئے ٹرنک نمودار ہو جاتے ہیں ان میں سے اوپر والے ٹرنک میں میرے دفتر جانے کے کپڑے ہیں وہ پہن کر پھر ان ٹرنکوں پر میز پوش ڈال کر اس کو میز بنا دیتا ہوں اور اس کا سامان جوں کا توں اس پر سجا دیتا ہوں۔ فرش پھر کر دیا جاتا ہے پلنگ پھر بچھ جاتا ہے اور میں سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی لا کر رکھ دیتا ہوں کہ دن میں بیگم کو تکلیف نہ ہو۔ اس عرصے میں بیگم واپس آ جاتی ہیں اور اپنی شاپنگ کے کمالات کو بڑے فخر سے اظہار فرماتی ہیں کہ دیکھو اسکو کہتے ہیں گوشت پھر یہ کہ سارے شہر میں اتنا سستا شاید ہی کہیں ملے اور ٹماٹر تو دیکھو سیب نظر آ رہے ہیں میں کچھ اختلافاً اور کچھ انتظاماً داد دیتا ہوا ان سے رخصت ہو کر دفتر چلا جاتا ہوں۔ دفتر سے واپسی کا سودا میرے ذمے ہے یعنی صبح کے ناشتے کے لیے بسکٹ، پان، رات کے لیے کچا گوشت ترکاری وغیرہ اس سلسلے میں روز باتیں سننا پڑتی ہیں کہ یہ گوشت آخر کس جانور کا اٹھا لائے ہو اور یہ جو ترکاری لائے ہو یہ اصلی ہے یا بناسپتی۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر اگر آدمی ذرا مسکرانے کا عادی ہو جائے تو بات زیادہ نہیں بڑھتی ورنہ اتنی سی کوٹھڑی میں بات کا بڑھ جانا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی تو خیر برحق ہے بشرطیکہ باقاعدہ میدان جنگ میسر ہو۔ ایک کمرہ لڑنے کے لیے ہو،

دوسرا بیوی کے بھولی سوچ کو بلینے کے لیے تعمیرا شوھر کے انڈے کر پڑے بنے سکتے ہیے اور چوٹھا سہے ہوئے بچوں کے لیے پھر یہ کہ اس جنگ کے باوجود ملازم کم سے کم کھانا وغیرہ پکاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام ارمان اس کوٹھڑی میں چونکہ پورے نہیں ہو سکتے لہٰذا مجبوراً صلح صفائی سے کام رکھنا پڑتا ہے"

ریاض کو اب کچھ ہنسی آئی اور کہنے لگا "عجیب مسخرے ہیں آپ بھی"۔

میں نے کہا "بھئی کون کافر تم سے مسخراپن کر رہا ہے میں تو بخدا اظہارِ واقعہ کر رہا ہوں۔ عجیب عجیب فوائد ہیں اس کوٹھڑی کے۔ تم کو معلوم ہے لکھنؤ میں میرا گھر سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آئے دن بھانت بھانت کے مہمان تو مستقل قیام کے لیے آتے رہتے تھے۔ پھر مقامی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کسی کے لیے بن رہی ہے تو کسی نے کہا چائے نقصان کرتی ہے شربت منگاؤ۔ کوئی بے تکلف دوست ناشتہ مانگ بیٹھا دن بھر اور آدھی آدھی رات تک دربار گرم رہتا تھا مگر جب سے یہ کوٹھڑی ملی ہے اول تو کوئی مہمان آیا ہی نہیں اور اگر آ بھی جاتے تو اس کوٹھڑی میں رہنے کے بجائے غالباً یہی مناسب سمجھے گا کہ قیام کا انتظام کرنے کے لیے کسی کی جیب کاٹ کر جیل چلا جائے۔ اگر بہت سے مہمان ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھہرانے کے لیے خود بھی جی چاہتا ہے اور پھر کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے مثلاً اب تم آ گئے ہو"۔

ریاض نے بات کاٹ کر کہا "بندہ نواز میں تو دو مہینے سے یہاں ہوں

اور صرف دو چیزیں تلاش کر رہا ہوں۔ ایک اپنے لیے مکان دوسرے جناب کا دولتخانہ"

میں نے کہا "شکر ہے کہ ایک چیز تو آپ کو مل گئی رہ گیا مکان اس کے متعلق اگر آپ فارسی جانتے ہوتے تو یہ مصرع پڑھتا کہ ؎

این خیال است و محال است و جنون

اور فی الحال آپ ہیں کہاں"۔

ریاض نے بیزاری سے کہا "ہوتا کہاں ہوٹل میں ہوں۔ میرا کیا ہے اکیلی جان نہ بیوی نہ بچے۔ پھر بھی آخر ہوٹل میں زندگی بھر تو کوئی رہ نہیں سکتا جی چاہتا ہے کہ اپنا بھی کوئی گھر ہوتا"۔

میں نے کہا "خیر اپنا گھر تو خدا کے فضل سے پورا پاکستان ہے البتہ یہ ہے کہ ہوٹل کے اخراجات بہت ہوتے ہیں"۔

ریاض نے کہا "بھیا اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہوں مجھے ایک مکان ملا تھا کرایہ زیادہ تھا اور مکانیت کم۔ تین کمرے تھے"

میں نے حیرت سے کہا "ایک نہ دو کمبخت تین کمرے۔ اچھا تو پھر"

کہنے لگا "میں نے لینے سے انکار کر دیا اور زیادہ گنجائش کے مکان کی تلاش میں ناکام رہ کر پھر جو گیا اُسی مکان کو لینے تیسرے دن تو معلوم ہوا کہ اب اس میں تین خاندان آباد ہیں۔ اپنا سر پیٹ کر چلا آیا۔ پھر پتہ چلا کہ ایک اور مکان خالی ہے وہاں گیا تو صاحب خانہ نے نہایت بے تکلفی سے پوچھا کہ شادی ہو

چکی ہے۔ میں نے کہا یا نہیں کہنے لگے اگر میں اپنی لڑکی کی شادی کر دوں تو اسے
کہاں سے جا کر دیکھے گا۔ عرض کیا گھر داماد بن کر رہنے کو تیار ہوں تو حضرت
سخت برہم ہوئے بولے کہ میں شادی اسی لیے تو کرنا چاہتا ہوں کہ لڑکی جائے
تو کچھ گنجائش پیدا ہو گھر میں۔ آپ آئے خود بھی یہاں سماتے پھلتے پھرتے نظر آئیے

میں نے کہا "بھئی ریاض صاف بات یہ ہے کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر ایک
موٹر گیراج خالی نظر آیا تھا کچھ دن ہوئے دیکھو اس کی بات کرتا ہوں۔"

ریاض نے ٹوپی پھر دل پر رکھنے کے انداز سے کہا "میرے بھائی اگر وہ مل
جائے تو میں بک جاؤں گا تمہارے ہاتھوں۔ تم ابھی چلو میرے ساتھ۔"

لاکھ لاکھ کہا کہ یہ دفتر کا وقت ہے۔ مگر آخر دفتر کے ایک صاحب کو جا کر عرضی
دینا پڑی اور ریاض کے ساتھ اس موٹر گیراج کی تلاش میں نکل گئے مگر آ کر دیکھتے
وہاں ایک بزرگ والدین اپنے ایک درجن بچوں کو لیے گیراج کے باہر نکل آئے
گیراج پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا جس کے سوراخوں سے دھواں نکل رہا تھا اور
اندر کسی ہانڈی میں میتھی کا بگھار دیا جا رہا تھا۔

اب ریاض کو بھی مجھ پر شک ہے اور میں شب و روز اس کے لیے مکان
اور رشتہ دونوں چیزیں ڈھونڈ رہا ہوں کہ یا تو مکان مل جائے ورنہ کوئی اسے
گھر داماد بنا لے۔ آج خبر آئی ہے کہ ایک رئیس ہیں ان کے گھوڑے کا انتقال
ہو گیا ہے خدا کرے اصطبل ہی مل جائے اور یہ چھینکا ریاض ہی کی قسمت سے ٹوٹا ہو۔

تعبیر طلب

مجھے اس وقت جو غصہ آ رہا تھا یہ غصہ کی وہ قسم ہے کہ تجزیہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کی اور کبھی کامیاب نہ ہو سکا کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہ غصہ اتفاقات کی غلطی پر آتا ہے یا اپنی بیچارگی پر اور ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ میں ان لوگوں کو نہایت احمق سمجھتا ہوں جو اس قسم کے موقعوں پر بھی نہ مشتعل ہوتے ہیں جھنجھلاتے ہیں بلکہ حسب معمول ہنسی خوشی مسکراہٹ اپنے لبوں پر لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ٹینس کھیلنے کے لیے جب سفید پتلون پہن چکے، سفید جوتے کے تسمے کس چکے اور ریکٹ ہاتھ میں لے کر باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ تمام پروگرام پر پانی پھر گیا۔ کپڑے بدلے۔ ریکٹ کو پریس میں کس دیا کہ چلو آج اپنی لائبریری ہی میں یہ خوشگوار موسم بسر کریں گے، سگریٹ کا ڈبہ لیا۔ پڑھنے کی عینک اٹھائی لائبریری میں پہنچ گئے جہاں چاروں طرف الماریوں میں ان مصنفین کی کتابیں سجی ہوئی تھیں جن

کچھ نہ کچھ عقیدت رہ چکی ہے۔ ابھی یہ طے نہ کیا تھا کہ اس وقت کس مُصنّف سے شرفِ نیاز حاصل کیا جائے گا کہ یکدم بجلی غائب۔ میرے نزدیک تو اس قسم کے موقعوں پر غصہ نہ آنا اگر حلم ہے تو یہ حلم یقیناً کوئی بیماری ہے جس کا علاج کرانا چاہیے کتنا اچھا موسم تھا کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں، کیا لطف آتا ہے اس وقت مطالعے میں۔ مگر ابر آلود فلک کج رفتار سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ اب اندھیرے میں گم بیوقوف بنے بیٹھے ہیں اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں تو کیا کریں۔ کچھ دیر روشنی آنے کا انتظار کیا۔ پھر مایوس ہو کر آرام کرسی پر لیٹ گئے مگر نگاہیں اس اندھیرے میں بھی اسی طرف تھیں جہاں وہ بلب لٹک رہا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے جگمگا رہا تھا گویا اگر اس کی طرف سے نگاہ ہٹ گئی تو روشنی آ کر واپس چلی جائے گی کہ میں کیوں آؤں جبکہ تم منتظر ہی نہ ہو —— معلوم نہیں کتنی دیر اسی طرح گم رہے کہ یکایک خس کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو میں لپٹی ہوئی ایک باوقار آواز آئی۔

"آداب"

سامنے ایک خاتونِ محترم لباس کی ترتیب اور رنگوں کے امتزاج میں پورا سلیقہ لیے کھڑی تھیں۔ میں چونک کر اُٹھ کر کھڑا ہوا اور نو وارد خاتون کو تعظیم دیتے ہوئے پوچھا، "کس کی تلاش ہے آپ کو؟"

خاتونِ محترم نے اپنی سنجیدگی میں ایک چھوٹا سا تبسم حل کرتے ہوئے فرمایا "جی! میں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد عرض کرنے ہی والا تھا کہ محترم میرا تخلص عجیب

نہیں ہے کہ وہ مجھ پر دل اُٹھیں۔" عجیب بات ہے۔ آپ کی لائبریری میں میری کتابیں موجود ہیں اور آپ مجھ کو نہیں جانتے۔ کاش ڈاکٹر گار میرے ساتھ ہوتے یا کم از کم تو ناش ہی ساتھ ہوتی کہ تعارف کی رسم تو ادا ہو جاتی۔"

میں ایک دم چونک پڑا۔ "آپ ..... آپ .... جناب۔ جناب امتیاز تو نہیں؟"

محترمہ جناب نے میری بوکھلاہٹ سے لطف لیتے ہوئے کہا۔ "کمال کیا کہ آپ بھی پہچان لیا۔ آپ مجھے مصنوعی حرارت سے پکے" انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نارنگی کا سینڈوچ کھاتے ہیں۔"

عرض کیا۔ "نارنگی اور ڈبل روٹی الگ الگ کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔"

محترمہ جناب نے فرمایا: "اناس کا سینڈوچ تو کھایا ہی ہوگا"

عرض کیا۔ "جی نہیں اناس کا زردہ البتہ کھا چکا ہوں، اور اناس کے کچالو بھی چکھے ہیں۔"

وہ مایوس ہو گئیں اور مجھے دکھ ہونے لگا کہ کاش میں نے نارنگی اور اناس کے سینڈوچ کھائے ہوتے۔ میں اس سلسلے میں معذرت پیش کرنے ہی کو تھا کہ وہ مجھ سے بیزار ہو کر موسم کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "اس ابر کے پیچھے گرمیوں کے آسمان پر سبز رنگ کا چاند دم بخود ہے۔ کائنات ایک عظیم سکوت اور خوفناک انجماد میں ڈوب کر رہ گئی ہے۔"

اور میں نے ندامت سے سر جھکا لیا اس لیے کہ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے

ہوا کہ میں نے نارنگی اور انناس کے ٹھنڈے مربے نہیں کھائے۔ میں اپنی آنکھوں سے ایک اشکِ ندامت پونچھنے ہی والا تھا کہ محترمہ حجاب نے فرمایا۔ "صبح پر بادل جھٹ جائیں گے تو ایشیائی جولائی کے دہکتے ہوئے آسمان پر نارنجی رنگ کا گستاخ آفتاب آگ برسائے گا۔"

میں نے احمقوں کی طرح کہا "جو خدا کو منظور ہو۔"

محترمہ حجاب نے فرمایا "اور پھر وہی آسمانی رنگ کی دوپہر ہو گی۔ آپ کے مکان میں کوئی فرانسیسی دریچہ ہے جس سے چمکیلے ایشیا کی بہار آفریں گرم صبح کا نظارہ دیکھا جا سکے؟"

میں نے عاجزی سے سر ہلا کر کہا "شاید ایک آدھ پاکستانی دریچہ ہو جس سے ایشیا تو ایشیا، لاہور بھی مشکل نظر آتا ہے۔"

محترمہ نے فرمایا "یہاں نہ نیلگوں چشم بلبلوں کے نالہ ہائے جگر خراش سے دل ہلتے ہیں، نہ یہ وہ ساحل ہے کہ چیلوں کی چیخ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے، نہ آسمان کا رنگ ایسا ہے جیسے بنفشے کا کھیت لہلہا رہا ہو، نہ سمندر ہے جس پر گہری نیلی چادر بچھی ہو، نہ یہاں پکے ہوئے سیبوں کی نکہت ہے نہ کچے لیموؤں میں بسی ہوائیں، جھینگروں کے نغمے بھی شاید ہی سننے میں آتے ہوں۔"

میں نے بڑی مستعدی سے کہا "جی نہیں جھینگر تو ایک سے ایک کلاسیکل خانے میں مل جائے گا۔ نہایت خوش آواز جھینگر ہیں، کبھی تنہا گاتے ہیں، کبھی کورس میں، اور رات کو مینڈک اپنے راگ چھیڑ دیتے ہیں ان کے وہ گانے سنتے سنتے ہیں اور کسی کام کا

نہیں رہتا"

محترمہ حجاب نے تجسس سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا "ورنہ آپ بھی آدمی تھے کام کے۔ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں وثوق کے ساتھ صحیح الدماغ کہا جا سکتا ہے۔"

میں نے سنبھل کر نہایت بیوقوفی سے کہا "درست فرمایا آپ نے"

غالباً محترمہ حجاب میری بیوقوفی کو تاڑ گئیں اور براہ راست مجھ سے سوال کیا "آپ اپنے کتب خانے میں میری کتابیں کیوں رکھتے ہیں؟"

عرض کیا "پڑھنے کے لیے!"

انہوں نے پوچھا "کیوں پڑھتے ہیں؟"

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں، علی الحساب عرض کر دیا "دلچسپی جو ہوتی ہے پڑھ کر!"

وہ سوال کرنے پر تُلی ہوئی تھیں "کیا دلچسپی ہوتی ہے؟"

عرض کیا "یہی کہ ـــ گویا ـــ میرا مطلب یہ ہے کہ خوب ہوتی ہیں آپ کی تصانیف!"

مگر وہ بخشنے والی نہ تھیں "کس اعتبار سے؟"

عرض کیا "ہر اعتبار سے"

کہنے لگیں "مثلاً جغرافیائی اعتبار سے ـــ"

گھبرا کر کہہ دیا "جی اور کیا"

وہ بے غصے کو جھٹکتے ہوئے بولیں "میں اپنی سب کتابیں واپس لینا چاہتی ہوں آپ فی الحال ڈومی نوس کھیلا کیجیے اور دانستہ چور بن جایا کیجیے کہ اس سے آپ کے

احساس میں بیگانگی پیدا ہو گی۔ کتاب بینی کا شوق ناپختہ قبل از وقت ہے۔ جی نیچے تو پڑھنے کو عمر پڑی ہے۔ غذا کا خاص خیال رکھیے صبح ناشتے میں ڈھائی چھٹانک کچی گاجریں، کچے اونٹ لیموں کا رس، قیمہ ٹماٹو اور ساگ، مونگ پھلیاں۔ کھانے میں سیب کا بھرتہ ۔۔۔"

میں سیب کے بھرتے کی ترکیب پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ غائب الماری سے ان کی تصانیف بھی غائب۔

میں بے تحاشہ اس دریچے کی طرف دوڑا جو سعدی یا فرانسیسی تو عمر کا رسالہ یا پاکستانی بھی نہ تھا مگر ابھی جھانک ہی رہا تھا کہ ایک اندر وکی آواز نے چونکا دیا۔

"السلام علیکم"

دوہرے جسم کے ایک صاحب عینک لگائے، پان کھائے، ہاتھ میں ڈبیہ بٹوہ وغیرہ موجود تھے میں نے رسماً کہا "وعلیکم السلام"!

وہ صاحب بغیر کسی رسمی تعارف کے بولے "صحیفہ اوستا اور شریعت زردشت میں عورت کے تحفظ ناموس کی بڑی تاکید کی گئی ہے قدیم ایرانیوں میں عورت کے حسن ظاہر بعد حسنِ باطن دونوں کے لیے کچھ اصول علم فراست اور قیافہ کے لحاظ سے متعین تھے ۔۔۔۔"

مرعوب ہو کر عرض کیا "درست فرماتے ہیں حضور ۔۔۔ مگر جناب کی تعریف؟"۔

وہ بدستور رجائی نہ انداز سے بولے "آپ کے دہانے کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی راز کو چھپانے کے اہل نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شیریں دفرہاد کی محبوبہ)

چاہیں صفت جمال میں سے شمائلیں پر حاوی تھی، مانہ کی ساخت کی وجہ سے رانو لری کی اہل نہ تھی، مگر حسن و اخلاق اور وفاداری کے لحاظ سے وہ بھی اس قدر بلند مرتبہ تھی کہ جب اس کا شوہر خسرو پرویز قتل کیا گیا اور شیرویہ فرمانروا ہوا تو اس لے خودکشی سے پہلے اپنے بال کھول دیتے نازک نازک ہاتھوں سے نازک سینہ پر جانہ برانداز قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر خستہ ہو کر آغوش طلب انداز میں گری مگر شیرویہ کے ساتھ رشتہ ازدواج منظور نہ کیا۔"

عرض کیا۔ "اور فرہاد اس زمانے میں کہاں تھا؟"

بے پرواہی سے بولے "وہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا۔"

عاجزی سے عرض کیا "میں اپنے مانے کی ساخت کے باوجود آپ کے نام کو زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

ایک تو کیا ہوا پان کھا کر چھالیہ چبانکتے ہوئے بولے "ایک چھوٹے وعدے سے زیر بار کرنے کے لیے اپنا نام بتائے دیتا ہوں:- نیاز"

میں نے چونک کر کہا۔ "نیاز ـــــ مولانا نیاز ـــــ نیاز فتحپوری شہاب کی سرگزشت کیوپڈ اور سائیکی"

نیاز صاحب نے میرا سلسلہ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نگار کے خریدار ہیں؟"

عرض کیا۔ "تھا تو مگر اب نہیں ہوں۔"

وہ بُرا مانے بغیر بولے "فراست الیہ ہے آپ کے پاس؟"

عرض کیا "تھی مگر میرے ہاتھ کی لکیریں اس میں نہ نکلیں، لہٰذا بیچ ڈالی"

کہنے لگے "شہوانیات؟"

عرض کیا "بچے پڑھا کرتے تھے اسے، کہیں گم کر دی"

مولانا نے فرمایا "نگارستان اور مالاتِ نیاز بھی آپ کے کتب خانے میں نہ رہنا چاہیے۔ میں اپنا شمار آئینہ فروشانِ شہر کوراں میں کرانا نہیں چاہتا"

اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑے، چھڑی کے دستے سے اپنی کتابیں الماری سے نکالیں اور قبل اس کے کہ میں معذرت کروں وہ تیزی سے نکل گئے۔ میں دروازے تک ان کے پیچھے گیا تاکہ نگار کا چندہ دے کر راضی کر لوں۔ مگر قبل اس کے کہ میں ان کو آواز دیتا کسی نے مجھ کو آواز دی:

"مسٹر —— سر جناب ——"

گھوم کر دیکھا ایک سرو قد اُلجھے بالوں والی ایسی خاتون کھڑی تھیں جو اپنے چہرے کی ساخت میں مسکراہٹ لیے تھیں۔ میں نے گردن کے خم سے ان کو تعظیم دی۔ وہ اپنے اُلجھے ہوئے بالوں کے گرداب حرکت میں لا کر بولیں۔ "میں نے آپ کو پروفیسر راماکل کرچی کے باغ کے اس خنک قطعے میں غالباً دیکھا ہے جہاں سنگل پائیاں بچھائی جاتی تھیں اور ماہیچال تکارام کے بھجن گاتی تھی"

میں نے چونک کر عرض کیا "آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہو رہی ہے؟"

خاتون محترم بولیں "آپ کو نسیان کی شکایت تو نہیں ہے؟"

عرض کیا "جی بالکل نہیں"۔

خاتونِ محترم نے ذوق سے حکم دے دیا "پھر تو اپنڈے سائیٹس کا ہونا ضروری ہے یہی شکایت ڈوپی کو ہو گئی تھی۔ وہ ایک مذہبی خدا ترس بی بی ہے جو برابر اداس رہتی ہے"۔

میں نے گھبرا کر پوچھا "خدا کے لیے بتا چکیے آپ قرۃ العین حیدر تو نہیں"؟

وہ بولیں "ہوں تو سہی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ترائی کا وہ اسٹیشن میرے ذہن سے نکل سکے گا جہاں منہ اندھیرے ایک ڈکا کھڑکی میں سے سر داخل کر کے کہتی ہے "چلیندرے لیجیے گا مس بابا؟" اور نرائن مالی جس کے گھر کے آنگن میں ہم بیٹھ کر امرود کھاتے تھے۔ میرا خدا جو مجھے ٹھنڈے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لیے جاتا ہے سینٹ کولمبا اگر مجھے میرا دماغ واپس مل گیا تو میں تمہارے سامنے چار شمعیں جلاؤں گی"

میں نے ہمدردی سے کہا "اللہ نے چاہا تو ضرور واپس مل جائے گا۔"

"نہ ہو اس سے مایوس امیدوار"

وہ اچانک بولیں "آپ کے پاس میرے بھی صنم خانے، ہے؟"

میں نے کہا "جی ہاں!"

وہ خوش ہو کر بولیں "اسی میں ہے۔ گاؤ میرے دوست اسی خوشی میں اولڈ لانگ زائن گاؤ ـــــ بلکہ ٹھہر جاؤ میں پکچی کو بلا لاؤں۔ گڈ اولڈ پکچی ـــ خدا کرے اس نے شادی نہ کر لی ہو۔ اب اس کے سارے پرابلم حل ہو جائیں گے اچھا بچے اب

یقیناً ACCEPT کرے گی۔"

میں بیوقوفوں کی طرح ان محترمہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تیزی سے الماری کی طرف گئیں اور میرے بھی ہضم نہ کرنے کی جلد نکال کر خوشی سے اچھل کر بولیں "تھینکس اے لوٹ گُڈ نائٹ — اب میں اپنے سٹر کو لوٹ جاؤں گی اور سینڈوچ ناشتہ کر کے سو جاؤں گی — گُڈ — نائٹ"

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ وعلیکم السلام کی طرح گڈ نائٹ کا جواب کیا ہے اور وہ ایک طرف کو نذر کرتی غائب ہو گئیں۔ شکر ہے کہ اسی وقت ایک مانوس سی آواز کان میں آئی۔ "کرو مجھے سلام تاکہ میں کہوں وعلیکم السلام؟"

میں نے گھبرا کر کہہ دیا "السلام علیکم"

اور اب جو مڑ کے دیکھا تو کوئی فقیر سبز مخمل کی ٹوپی لمبا کرتہ گھٹنے تک اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنے ایک کامل و ماہر بزرگ نہایت ذہانت سے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھ کو حیران دیکھ کر نہایت مٹھاس سے بولے "وعلیکم السلام۔ اور اب سنو میری بات کہ دوسروں کے عیب دیکھو تو پہلے اپنے عیبوں کا تصور بھی کر لیا کرو۔ ایسا کرو گے تو خدا تم کو عیبوں اور گناہوں سے بچائے گا اور تم پر رحم کرے گا۔ اور جب خدا کسی بندے پر رحمت کی نظر ڈالتا ہے تو وہ آدمی دل کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پس میں دل کا بادشاہ بن گیا ہوں اور تم سب کو بھی دل کی بادشاہی تقسیم کرتا ہوں کہ تم بھی میری طرح اپنے گناہوں کو یاد کرو اور خدا سے توبہ کرو اور خدا سے کہو کہ اے خدا مجھے بھی مسلمان بنا۔

میں نے اپنی بزرگ محترم کے تقدس سے دل ہی دل میں لرز کر کہا۔ "حضور تشریف تو رکھیں تاکہ میں شربت یا آئس کریم، کوئی چیز پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں۔"

بزرگ محترم نے خندہ پیشانی سے فرمایا۔ "جو میری چھوٹی لڑکی کوثر بانو نے آئس کریم بنائی تھی میں خواجہ محل کے بالاخانے میں تحریری کام کر رہا تھا کہ زیدیا شا آئس کریم لے کر آئے میں نے کہا بیٹیا اس سے مجھے خون آتا ہے، میں نہیں کھاتا، وہ چلے گئے تو حسن الطالب لے کر آئے اور کہا کہ کوثر کی دل شکنی ہو گی چکھ لیجئے، میں نے اپنی طشتری صاف کر دی اور کہا۔ ہر چہ بادا باد، من در شکم برف انداختم"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "میں آپ کو پہچان گیا، حضرت خواجہ حسن نظامی"

خواجہ صاحب نے فرمایا۔ "آپ تو مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے میں عید کا چاند ہوں اور جیسے آپ کہنے ہی والے ہیں، ٹو مائی ڈیر عید کریسنٹ!"

میں نے عقیدت سے کہا۔ "آپ کی تصانیف نے آپ سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ مجھے واقعی آپ سے مل کر اتنی ہی خوشی ہونا چاہیے تھی"

خواجہ صاحب نے فرمایا۔ "اگر میں آپ کی خوشی کا بہانہ بن گیا ہوں تو اپنے کو مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں ورنہ خوش اقبال لوگ تو خوش رہتے ہی ہیں"

میں نے عرض کیا۔ "نہیں خواجہ صاحب میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ بلا کے سخت کوش ہیں"

خواجہ صاحب بولے۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں، حکیم کہتے ہیں، تجربہ کار دوست کہتے ہیں

خواجہ ذکرتی ہیں، عشقی شاہ کہتے ہیں اور خود میرا دل بھی کہتا ہے کہ ماغی محنت کی کثرت ان بیماریوں کی بنیاد ہے لیکن اگر میں کام ترک دوں گا تو کام بھی مجھے ترک کر دے گا۔"

میں نے کہا "خیر یہ باتیں ہوتی رہیں گی خواجہ صاحب اگر مجھے ایک بات پوچھ لینے دیجئے کہ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ نے جارج برنارڈ شا کا فاتحہ کرلیا تھا!

خواجہ صاحب نے ہنس کر کہا "اس میں تعجب کی کیا بات ہے میجر جنرل ڈکسن نظامی کی وفات کے بعد میں نے مسٹر جارج برنارڈ شا کا ایک اعلان اخباروں میں پڑھا کہ آئندہ ساری دنیا کا مذہب اسلام ہوگا میرا عقیدہ ہے کہ جارج برنارڈ شا چشتی نظامی تھے۔"

میں نے حیرت سے کہا "جی کیا فرمایا جارج برنارڈ شا اور چشتی نظامی؟

خواجہ صاحب نے فرمایا "جی ہاں میں نے اپنے خلفا کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی ہے کہ وہ اپنی مجلسوں اور نیازوں میں میجر جنرل ڈکسن نظامی اور جارج برنارڈ شا چشتی نظامی کے نام لیکر نیاز دیا کریں۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ جارج برنارڈ شا چشتی نظامی کی فاتحہ برکت کا سٹ پر جا پہنچے گا یا لنچ پر یا ڈنر پر کہ خواجہ صاحب نے یکا یک سوال کیا۔

"آپ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم سے کبھی ملے ہیں؟"

میں نے کہا "جی نہیں اس سعادت سے ناشاد رہا ہوں۔"

کہنے لگے "تو مثنوی ہمارا شاہ ضرور پڑھیے۔ یہ مثنوی مسجدوں میں سناتے ہیں۔ یہ مثنوی کم از کم ستّرہ مرتبہ یعنی ستّرہ آدمیوں کو ضرور دکھانی ہے اور سنانی ہے۔"

میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر اٹھارویں مرتبہ میں نے کسی کو سنا دی تو کفارہ کیا دینا ہوگا۔ مگر خواجہ صاحب نے کتابوں کی الماری سے میری ایک کتاب نکال لی جو میں نے سر تیج بہادر سپرو کے نام معنون کی تھی۔ خواجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"آپ نے یہ بہت اچھا کیا — سر تیج اصل میں اردو کے سرتاج تھے۔ وہ سپرو نہیں بلکہ اردو کے سپر تھے"۔

اور یکایک سر تیج بہادر سپرو ڈھال بنے ہوئے میرے تصور میں آ گئے۔ خواجہ صاحب سے تو رنگ ختائی فرماتے تھے "اردو ہماری زبان ہے جس سے مراد ہے ہندو اور مسلمان "ہم" سے ہندو اور "تم" سے مسلمان — وہ مل کر ہوئے "ہم" —

میں عقیدت کی شدت سے بوکھلا کر رہ گیا اور خواجہ صاحب نے اسی بوکھلاہٹ کو مدح سمجھ کر ارشاد فرمایا "آپ پریم راگی سے قوالی ضرور سنا کیجیے۔ اس سے آپ کے قلب کی رقّت میں انجذابی کیفیت پیدا ہوگی اور موسیقی سے طبیعت میں ایک تغیر منجانب اللہ پیدا ہو جائے گا۔"

میں پریم راگی کا پتہ نوٹ کرنے کے لیے پنسل اٹھانے کو جھکا ہی تھا کہ خواجہ صاحب کا کچھ خیال زیدی کی جلد الماری سے نکال کر رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ ایک دھڑکا تھا

ہوا۔ چنانچہ عینک لگائے نظر آیا مگر یہ ڈھانچہ پرانا بھی تھا۔

"پہچانا مجھے؟" یہ کہہ کر میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ایک پھول بنا دیا اور پھر اس پھول کی پتیاں بناتے ہوئے کہا" مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ بہت شوق تھا۔ ہر روز ملنے کا ارادہ کرتا تھا۔ میں آپ کو اپنی تصویر دکھاتا ہوں۔ میری تصویر دیکھ کر آپ مجھے آسانی سے پہچان سکیں گے بات یہ ہے کہ یہ تصویر اصلی ہے اور میں خود کچھ نقلی سا ہوں۔ اس تصویر میں جو میری آنکھیں ہیں وہ آپ کے دل و دماغ پر چھا جائیں گی بات یہ ہے کہ یہ تصویر ساکت ہے لہٰذا میں ذرا اچھا ہوں۔ اس تصویر کو دیکھیے یہ تصویر بھی خاموش ہے اور عینک کے پیچھے بڑی بڑی اداس آنکھیں بھی خاموش ہیں بہت سی عورتیں یہ تصویر دیکھ کر منہ بنا لیتی ہیں مگر تنہائی میں چپکے سے ان آنکھوں کو چومتی ہیں، اسی چوما چاٹی کی کثرت نے میری نظر کمزور کر دی ہے اور میں عینک لگانے لگا ہوں۔

میں حیرت سے ان حضرت کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر وہ نام پوچھنے کی مہلت ہی نہ دیتے تھے۔ کہتے ہی چلے گئے۔ "آپ یقین کیجیے کہ اگر میں عورت ہوتا تو میرے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے میرے سینے کا ابھار یقیناً چھنیاں کھاتا اور جو کوئی مجھ کو دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں چپٹ جاتیں مگر میں یقیناً ایسی چال نہ چلتا کہ لوگ اونچی ایڑی کے جوتے کو میرا اپنا شوق سمجھتے نہ میں ایسا غرارہ پہنتا جس کی سلوٹوں کا گھیراؤ بھدا ہوتا۔ میں اس طرح کبھی [illegible]

کہ بڑے کو بڑی لذت اس آنکھیں بند ہوتے ہی خیالاں باز دیک عورت ڈھلک جاتا ہے!

میں نے تنگ آکر کہا اچھا" حضرت پہلے یہ تو بتایئے کہ میں کن صاحب سے ہمکلام ہوں۔ جناب کا اسمِ مبارک؟

وہ صاحب عجیب سرشارانہ انداز سے بولے" بہت سے نام ہیں میرے۔ ٹھنڈا گوشت۔ کھول دو۔

میں ایک دم چیخا" لو سے ارے، منٹو صاحب۔ سعادت حسن منٹو۔ اردو ٹاپ کے رائٹر ولے انشا پرداز ——— خوزیبِ داستان اور افسانہ نگار"

منٹو صاحب نے میری بداخلاقی سے بے مزہ ہوتے ہوئے کہا" اب ایسی باتیں نہ کیجئے کہ میرا نشہ اتر جائے۔ میں اس وقت مغویہ اور برآمد کی ہوئی لڑکیوں کے متعلق غور کر رہا ہوں اور میرے ذہن میں صرف چوسے ہوئے پیٹ ابھر رہے ہیں۔"

میں سوچنے لگا۔ یا اللہ اس کا ذہن کس طرح کی چھلکیاں کھاتا ہے، مگر وہ بولتے ہی رہے" اور کیوں جناب ان کو مغویہ کیوں کہا جاتا ہے انہیں اغوا کب کیا گیا۔ اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے جس میں مرد اور عورت دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے تار تن کر جھنجھنا اٹھتے ہیں۔"

میں نے صفائی پیش کی" منٹو صاحب، خدا گواہ ہے میں نے اس کا نام اغوا یا ان عورتوں اور لڑکیوں کا نام مغویہ نہیں رکھا ہے۔"

وہ تلخی سے بولے "تم ۔ تم تو شکاری ہو ۔ صحافی ، افسانہ نگار اور شاعر قلم اٹھائے
شکار میں مصروف ہیں ۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا ، تم انسان کو ہندو اور مسلمان سمجھتے ہو
تم کہتے ہو ایک لاکھ ہندو مرا یا ایک لاکھ مسلمان مرا ۔ تم یہ نہیں کہتے کہ دو لاکھ انسان
مرے ۔ تم سمجھتے ہو کہ ہندوؤں سے مذہب شکار کئے جاتے ہیں ۔ بیوقوف
چوک فرید دیکھا نہیں اور بن بیٹھے افسانہ پرداز ۔۔۔"

میں نے منانے کی بہت کوشش کی بلکہ وعدہ کیا کہ پرمٹ ملے گا تو امرتسر جاؤں گا
اور چوک فرید دیکھ آؤں گا ، مگر منٹو صاحب اس بیگانگی سے چلے گئے جیسے منٹو پارک کا
سبزۂ بیگانہ ۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا دروازے تک جا کر واپس لوٹ آیا ۔ اور
لوٹ کر ایک دم چونک پڑا ۔ بڑی بڑی آنکھوں کی ایک سادہ اور معصوم مگر سادہ اور معصوم
سے زیادہ نحیف و نزار خاتون جن کو کمزوری نے لڑکی بنا رکھا تھا ، کھڑی ہوئی نظر آئیں
اور سلام کے بجائے صرف مسکرا دیں ۔ میں بھی مسکرانے کی کوشش میں دانت نکال کر
رہ گیا ۔ وہ مختصراً بولیں "آپ بڑے سنکی آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ کرنٹ آف ہو جانے
سے گھبرا جاتے ہیں ۔ آخر چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کا تصور کیوں نہیں کر لیتے ،
آسمان پر جلتے ہوئے یہ روپہلے تارے آخر یہ کس کام کے ہوتے ہیں ۔ ؟"

میں نے نہ جانے کیوں یہ بیہودہ بات کہہ دی "میں سمجھا نہیں آپ کیا فرما رہی ہیں"

وہ جل کر بولیں "کبھی مت سمجھو ۔ ایک ذرا سمجھ لیتے تو جانے کیا ہو جاتا ۔ یہاں تکیہ
بھی تو نہیں ہے کہ میں اپنا سر اس پر دے ماروں"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آج ہی صبح اس کمرے سے نگار خانہ اٹھوا لیا ہے میں سوچ رہا تھا اور وہ میرے جواب کی منتظر تھیں۔ خوش ہو کر بولیں "آپ کچھ بولو بھی میرا انتظار دم توڑ کر نہ رہ جائے۔ جی چاہتا ہے کہ سسک سسک کر رو دوں"۔

میں نے بلک بلک کر ہنستے ہوئے کہا "میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کون ہو سکتی ہیں"

وہ بولیں "میں گئی ہو لے میں، پہلے اپنے متعلق تو غور کرو کہ تم کون ہو سکتے ہو، میں نے تو غلطی کی جو تمہارے پاس آ گئی، وقت ایلو محل کی طرح گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا میں نے کہا چلو ان حضرت سے مل آئیں، یہاں آ کر میرا دھڑکتا ہوا دل عذاب سے ڈوب گیا، اب یہاں سے جاؤں گی اور نئی اور پرانی باتوں کے ملبے تلے پڑی کراہتی رہوں گی، میں کرسی پر ہونٹ کھول کر بیجان سی لیٹ جاؤں گی اور میرا چہرہ جذبات سے بالکل خالی ہو گا"

میں نے پہچان لیا اور گویا نعرہ بلند کیا "آپ —— ہاجرہ مسرور"

وہ میری حماقت پر مسکرائیں "جی نہیں —— میں خدیجہ مستور ہوں"

میں نے کہا، "وہ ایک ہی بات ہے۔ عطر ایک ہی ہے خواہ کارخانہ اصغر علی کا ہو یا محمد علی کا"

یکایک سر پر لٹکا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشنی آ چکی تھی۔ کتابوں سے الماریاں بھرپور تھیں اور تمام مصنف غائب تھے۔ کاش کتابیں غائب ہوتیں اور مصنف موجود ہوتے۔

بیگم نفیس کے میاں

بیگم نفیس کے میاں یعنی خود نفیس صاحب کا زیادہ سے زیادہ تعارف صرف یہ کرایا جا سکتا ہے کہ آپ ہیں نفیس صاحب یعنی بیگم نفیس کے میاں۔ اس لیے کہ ان کی ذاتی خصوصیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی مشہور معروف بیوی کے شوہر واقع ہوئے ہیں اور خود ان کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ع ہیں چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں

شادی سے پہلے بھی نفیس میں کوئی انفرادیت تو خیر نہ تھی مگر پھر بھی مردم شماری کا ایک ہندسہ ضرور تھا۔ دوستوں کا دوست تھا اپنے گھر پر اپنے نام کی تختی لگاتا تھا نوکر چاکر خواہ دل میں اس کو کتنا ہی بیوقوف کیوں نہ سمجھیں مگر منہ پر ہمیشہ صاحب ہی کہتے تھے اس میں شک نہیں کہ بہت ہی کم عقلی کی باتیں کرتا تھا مگر شادی کی بیوقوفی کر کے اس نے واقعی بیچ منجدھار اپنے کو ڈبو دیا۔ ہم لوگ اس کو سمجھایا کرتے تھے کہ

دیکھو بھئی نفیس اور چاہے جو کچھ کرو مگر شادی ہرگز نہ کرنا ورنہ مارے جاؤگے اور
اگر ایسی ہی شامت منڈلانے لگے اور شادی موت کی طرح برحق ہی ہو جائے تو
بیوی کا انتخاب ذرا سمجھ بوجھ کر نا ہر چند کہ یہ بات مشکل ہے کہ تم کو کوئی اپنے سے
زیادہ احمق قسم کی لڑکی مل سکے مگر یاد رکھو کہ اگر تم نے اپنے سے زیادہ بیوقوف
عورت سے شادی نہ کی تو تمہاری زندگی عذاب ہو جائے گی۔ یہ اندیشہ لوگ یوں
کر رہے تھے کہ جتنا یہ شخص احمق تھا اتنی ہی دولت اس کے پاس تھی اور آپ جانیں
دولت سے کیا کچھ نہیں خریدا جا سکتا پھر ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑی خوش قسمتی
اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا امیدوار جتنا مالدار ہو اتنا ہی بیوقوف بھی ہو اپنی چہیتی
بیٹیوں کے لیے والدین اسی قسم کا بر تو ڈھونڈھتے ہیں چنانچہ ان حضرت کو بھی
ایک بخت آور لڑکی کے خوش نصیب والدین نے ڈھونڈھ لیا اور یہ حضرت انکے
معیار پر پورے اترے چنانچہ ہم لوگوں کو اطلاع ہوئی کہ نفیس کی شادی ایک
ایسی لڑکی سے ہو رہی ہے جو نہ صرف گریجویٹ ہے بلکہ اپنے کالج کی یونین کی
صدر بھی رہ چکی ہے اور تقریری مقابلوں میں کئی انعام حاصل کر چکی ہے تو اس بلبل
ہزار داستان کا اپنے مخلص چغد سے مقابلہ کرنے کے بعد ہم سب پھر اپنی دوستی
کا حق ادا کرنے نفیس کے پاس گئے اور ان کو بڑی دلسوزی سے سمجھایا کہ آخر کیوں
اپنے لیے یہ جیتی جاگتی موت خرید رہے ہو مگر وہاں نقشہ ہی دوسرا تھا ان حضرت
کے کمرے میں ہر طرف ان ہی صاحبزادی کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ غسل بیس پر ان

صاحبزادی کی وہ تصویر تھی جس میں وہ بی اے کی ڈگری لیے گون پہنے کھڑی تھیں ریڈیو پر چاندی کے فریم میں وہ تصویر تھی جس میں اس لڑکی نے تقریری مقابلے میں ایک قد آدم کپ جیتا تھا لکھنے کی میز پر وہ تصویر تھی جس میں بیڈ منٹن ٹورنامنٹ کا کپ لیے یہ صاحبزادی کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اور یہ تمام تصاویر نفیس ایک ایک کو دکھاتے تھے اور ہر تصویر کے سامنے جا کر نہایت احمقانہ ہنسی ہنستے تھے۔ ہم لوگوں نے یہ تمام تصاویر دیکھیں نفیس سے اس لڑکی کے متعلق تمام معلومات حاصل کیں اور جب نفیس صاحب سب کچھ بیان کر چکے تو ہم لوگوں نے نہایت سنجیدگی سے بیٹھ کر ان کو سمجھانا شروع کیا اور ابتدا اعجاز نے کی۔

"اچھا بھئی ایک بات بتاؤ نفیس کہ کیا تم واقعی اپنے کو اس لڑکی کے قابل سمجھتے ہو!"

اس سنجیدہ سوال پر نفیس نے ایک احمقانہ قہقہہ لگا کر کہا "یہ تو وہی بات ہوئی کہ ع   یہ سچ ہے میں تیرے قابل نہ تھا تو میرے قابل تھا۔"

احسن نے کہا "صاحب ہم لوگ مذاق کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ آپ کو آخری مرتبہ یہ بتانے آئے ہیں کہ یوں تو خیر آپ نے زندگی بھر حماقتیں فرمائی ہیں اور اپنے وقت کے آپ نہایت عظیم المرتبت احمق ہیں مگر خدا کے واسطے یہ زندگی بھر کا عذاب نہ خرید لیجئے۔"

میں نے کہا کہ بھئی اس طرح نہ کرو یہ بات کہ یہ حضرت اس کو مذاق سمجھیں بلکہ

صاف صاف یہ پوچھو کہ کیا واقعی اس لڑکی کو خوش رکھ سکو گے؟"

نفیس نے اپنے چہرے کو اس طرح سنجیدہ بنایا کہ وہ اور بھی احمق نظر آنے لگا۔

"کیوں خوش نہ رکھ سکوں گا۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ لڑکی جس طرح اب تک آزاد رہی ہے اسی طرح آزاد رہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں کبھی اس کی آزادی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ لڑکی کو قومی خدمات کا بڑا شوق ہے میں نے کہا کہ یہ شوق تو بہت ہی اچھا ہے۔ ان کی شرط یہ تھی کہ شادی کے بعد لڑکی کو ولائت کی سیر کرائی جائے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ خود میرا بھی پروگرام ہے کہ شادی کے بعد یورپ کی سیاحت کروں گا۔ انہوں نے کہا لڑکی پردہ نہ کرے گی میں نے کہا کہ اگر پردہ کرتی ہوتیں تو بھی میں پردہ ترک کرا دیتا۔"

اعجاز نے کہا "بس گویا اس کے بعد آپ نے سمجھ لیا کہ آپ اس لڑکی کو خوش رکھ سکیں گے"

احسن نے کہا "نفیس بھائی دیکھو ہم تمہارے دوست ہیں دشمن نہیں ہیں کہ تم کو غلط راستے پر جاتا ہوا دیکھ کر خوش ہوں اور چونکہ ہم تم کو غلط راستے پر جاتا ہوا دیکھ رہے ہیں لہٰذا تم سے صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ تم اس شادی کے نام سے خودکشی کرنے جا رہے ہو۔"

نفیس نے پھر احمقانہ قہقہہ لگا کر کہا "یار چھوڑو بھی اس بیہودگی کو اور یہ بتاؤ کہ میں اس دلھن کے لیے زیور کیا کیا بنواؤں۔"

میں نے کہا "زیور گئے جہنم میں پہلے ہم ہماری بات سن لو کہ ہم لوگوں نے اس لڑکی کے متعلق جو کچھ دوسروں سے سنا ہے اور جو تم سے تصدیق ہوئی ہے اس کے بعد ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ تم شادی اور طلاق دونوں کی تیاریاں ساتھ ہی ساتھ کرو ایسی لڑکی ایک دن بھی تم کو گوارا نہ کر سکے گی تم لاکھ اس کے لیے زیور بنوا لو قیمتی سے قیمتی پوشاکوں کے انبار لگا دو ولائت جانے کے لیے پاسپورٹ بنوا رکھو اپنے گھر کو اس کے لیے ہر نعمت سے آراستہ کر دو مگر جب وہ تم کو دیکھے گی اور تمہاری حماقتوں کا اندازہ اس کو ہو گا تو سب سے پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ آئے گا کہ اس شخص کے ساتھ یہ پہاڑ سی زندگی کیونکر بسر ہو گی ——؟"

احسن نے کہا "نہیں بھئی یہ نہ کہو بعض لڑکیاں اس کو تو اپنے لیے خدا کی دین سمجھتی ہیں کہ شوہر لینے کو جائیں اور چند صحرائی پکڑ لائیں، مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا اس لڑکی کے ساتھ حضرت ایک دن بھی شوہرانہ زندگی گزار سکیں گے"۔

اعجاز نے کہا۔ مجھے بھی احسن کی رائے سے اتفاق ہے مجھکو اس سنجوگ کا ایک ہی نتیجہ نظر آ رہا ہے کہ ہمارے عزیز دوست بھائی نفیس اب گئے ہاتھوں سے اس شادی کے بعد ان کی حیثیت یہ ہو گی کہ زیادہ سے زیادہ بیوی کے باڈی گارڈ بنکر رہ جائیں گے اور وہ اس موم کی ناک کو جس طرح چاہے گی موڑ دیا کرے گی یہ اس کی انگلی کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچیں گے اور یہ گائے جائیں گے کہ ہے ، ہر طرز یکہ کہ می رقصانیم اے یار می رقصم ،

میں نے نفیس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے کہا "میری جان برا نہ ماننا یہ لڑکی واقعی تمہاری اوقات سے بہت زیادہ ہے اور تم کبھی اس کے شوہر بن کر نہ رہ سکو گے اس وقت تم بڑے چاؤ سے یہ شادی کر رہے ہو تم خوش ہو کہ تم کو ایک تعلیمیافتہ روشن خیال اور ذہین لڑکی مل رہی ہے مگر تم صرف اس کو دیکھ رہے ہو اور اپنے سامنے آئینہ نہیں رکھتے یاد رکھو اس شادی کے بعد زندگی بھر بیوی والے ہوتے ہوئے بھی بیوی کو ترسو گے. شوہر ہوتے ہوئے بھی شوہرانہ زندگی تم کو میسّر نہ ہو گی ہم لوگ اپنی حیثیت سے مجبور ہو کر نوکری کر کے افسروں کی ماتحتی برداشت کرتے ہیں، مگر تم صاحب حیثیت ہو کر بھی ماتحتی زندگی بھر کے لیے خرید رہے ہو۔ تم کو اس بیوی کی غلامی کرنا پڑے گی یہ بیوی انشاء اللہ تمہاری ناک میں کوڑی پہنا دے گی۔

مگر یہ سب سمجھانا بے سود ہوا نفیس احمقانہ ہنسی ہنستا رہا اور مذاق میں اس باتوں کو ٹالتا رہا نتیجہ یہ کہ یہ شادی ہو گئی بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی. احباب نے خوب خوب پلاؤ کھائے مجرے دیکھے جشن منائے اور شادی کے بعد ہی نفیس اِدھر اپنی دُلہن کو لے کر ولائت روانہ ہوئے اُدھر ہم لوگوں نے ان کے ایصالِ ثواب کے لیے مجلس عزا منعقد کی جس میں نفیس کی یاد میں کئی مرثیے پڑھے گئے اور اس مصرعے سے تاریخ وصال نکالنے کی ناکام کوشش کی گئی کہ ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نفیس اور اس کی دُلھن چھ سات مہینے کی سیاحت کے بعد لوٹے مگر ان کی قریبی

کہ ہم لوگوں کو خود اس نے نہیں بلکہ دوسرے ذرائع سے خبر ہوئی خیر ہم لوگوں میں تکلف تو تھا ہی نہیں کہ یہ شکایت لے کر بیٹھ رہتے۔ یہ سنتے ہی ان کے گھر کا رُخ کیا مگر وہاں کا اب نقشہ ہی دوسرا تھا۔ جاتے ہی کوٹھی کے برآمدے میں ہم نے دیکھا کہ ایک ٹائپ رائٹر کھڑک رہا ہے اور نفیس سراسیمگی کے عالم میں ٹہل رہے ہیں ہم لوگوں کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ گرمجوشی سے دوڑ کر لپٹ جاتے۔ ان حضرت نے ایک رسمی سے تبسم کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اور سب سے پہلی بات جو کی وہ یہ تھی کہ:۔

"بھئی معاف کرنا جب سے آیا ہوں سخت مصروف ہوں۔ اب یہ دیکھو بیگم نفیس کا خطبۂ صدارت ٹائپ ہو رہا ہے اور آج ہی شام کو انہیں گرلس کالج کے یوم تاسیس کی صدارت کرنا ہے بہرحال پھر ملیں گے انشاء اللہ۔

ہم لوگ اپنا سا منہ لے کر چلے آئے اور اب واقعی تکلف شروع ہو گیا یعنی ہم نے یہ طے کر لیا کہ اب ان حضرت سے اس وقت ملیں گے۔ جب یہ خود ملنا چاہیں ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ان کو یہ ضرورت کبھی پیش نہ آئی۔ البتہ ہم اخبارات میں بیگم نفیس کی مصروفیات دیکھتے رہے کہ آج بیگم نفیس نے انجمن خواتین کے جلسے میں یہ تقریر فرمائی اور کل بیگم نفیس نے فلاں ٹورنامنٹ کے فائنل میں انعامات تقسیم کیے۔ آج بیگم نفیس اس ڈنر میں تھیں اور کل نفیس کی تصویر یہ ہوائی اڈے پر کسی معزز مہمان سے ہاتھ ملاتے ہوئے نظر آئی، مختصر یہ کہ اب بیگم نفیس کی ہر طرف

دھوم تھی اور کیوں نہ ہوتی دھوم ان کے پاس اپنی ذاتی ذہانت تھی اور میاں کی دولت ان کے لیے شہرت خریدنے کو موجود تھی۔ بہر حال ہم لوگوں سے اب نفیس کا کوئی واسطہ نہ رہا اور ہم واقعی ان کو صبر کر کے بیٹھ رہے۔

مدت کے بعد یونیورسٹی ہال کے ایک جلسے میں خود نفیس نے آ کر پیچھے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھ کو چونکا دیا اور میں نے مدت کے بچھڑے ہوئے ساتھی کو دیکھ کر اعجاز اور احسن کو آواز دی کہ لو بھئی مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ آج بھی جناب تنہا تشریف نہیں لائے ہیں بلکہ بیگم کے اردلی کی حیثیت سے تشریف آوری ہوئی ہے بڑے فخر سے کہنے لگے۔

"بیگم کی تقریر ہے نا"

اعجاز نے پوچھا "تو کہاں ہیں بھابی"

نفیس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ کیا بیٹھی ہیں ڈائس پر وائس چانسلر کے ساتھ۔"

احسن نے کہا "اور تم یہاں کیا کر رہے ہو"

نفیس نے کچھ خفیف ہو کر کہا "اور میں کہاں ہوتا کوئی مجھے تقریر کرنا ہے۔ نہیں کہ میں بھی ڈائس پر ہوتا بہر حال تم لوگوں سے ملنے کا موقع ہی بن گیا۔"

میں نے بھی موقع کو غنیمت جان کر کہا "اچھا یہ بتا نفیس تجھ کو اپنی اس ڈائس پر بیٹھی ہوئی بیگم ہی کی قسم کہ کبھی کبھی تو اپنی پر غور کرتا ہے شادی

کے بعد تیری ذاتی حیثیت کیا رہ گئی ہے۔

نفیس جواب دینے کے لیے کھسیانی ہنسی کے بہانے کچھ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ لاؤڈ سپیکر پر وائس چانسلر کی آواز گونجی۔

"میں بیگم نفیس سے درخواست کروں گا کہ اس اجتماع سے خطاب فرمائیں"

اور ہال میں تالیوں کی گونج پیدا ہو گئی اور ڈائس پر بیگم نفیس نہایت وقار کے ساتھ مائیکروفون کے پاس آ گئیں۔ تالیوں کے شور کے بعد ان کی آواز کی لہریں کانوں سے ٹکرانے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں اس جادو بیان مقررہ نے ایسا سماں باندھ دیا کہ واقعی اس کی خطابت کا قائل ہونا پڑا۔ میں دیر تک بیگم نفیس کی تقریر میں گم رہا اور پھر یکایک پاس بیٹھے ہوتے نفیس کا خیال ہو آیا تو میں نے اس پر نظر ڈالی وہ منہ کھولے آنکھیں پھاڑے نہایت احمقانہ انداز سے بیوی کی تقریر سن رہا تھا اور میرے دِل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کیا واقعی بیگم نفیس اس احمق کی بیوی کہلا کر خوش ہوں گی۔ میں اس بات پر غور کرتے کرتے اتنی گہرائی میں پہونچ گیا کہ مجھ کو اب نفیس سے نہیں بلکہ بیگم نفیس سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ بیگم نفیس کی یہ تمام سرگرمیاں یہ تمام مصروفیتیں اور یہ تمام قومی کام دراصل غم غلط کرنے کے مختلف بہانے ہیں وہ اپنی اس ازدواجی زندگی سے فرار ڈھونڈھتی ہوں گی جس میں یہ جانور ان کو شوہر کی حیثیت سے نظر آتا ہو گا اور ان کے لیے ازدواجی زندگی کو ویرانی ثابت کرتا ہو گا عورت فطرتاً اپنی برتری نہیں چاہتی تا کہ اپنے سے برتر کی سپردگی میں اپنے کو دے کر زیادہ مطمئن اور خوش رہ سکتی ہے اور یہ

اطمینان اور یہ خوشی اس بدنصیب عورت کو اس احمق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس نے زندگی کو ایسے ہنگاموں کے سپرد کر رکھا ہے کہ شوہر کا خیال کم سے کم اس کے قریب آئے۔ میں کبھی ان خیالات میں کھو جاتا۔ کبھی بیگم نفیس کی تقریر سننے لگتا اور کبھی اس منہ کو دیکھنے لگتا جس کی مسور کی دال بیگم نفیس تھیں۔ کہ یکایک تالیوں کی گونج میں بیگم نفیس اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئیں اور دوسرے مقرر یکے بعد دیگرے اُٹھنے لگے۔ نفیس نے مجھ کو باہر چلنے کا اشارہ کیا چنانچہ میں چپکے سے باہر نکل آیا پھر اعجاز اور احسن بھی کھسک آئے۔ اعجاز نے آتے ہی کہا

"یار کتنی خوبصورت تقریر کی ہے بیگم نفیس نے واہ۔ وار نشے آگئے"۔

احسن نے کہا "تقریر سننے کے بعد اب مجھ کو اور بھی نفیس پر رحم آ رہا ہے"۔

میں نے کہا "مگر میں نے غور کیا ہے تو زیادہ قابلِ رحم بیگم نفیس ہیں۔

ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سراج ہم لوگوں کو دیکھ کر کہیں اور جاتا جاتا اسی طرف آ گیا۔ میں نے سراج سے نفیس کا تعارف کرایا "بھئی سراج ان سے ملو یہ ہمارے مرحوم دوست نفیس صاحب"۔

سراج نے ہاتھ ملا کر وہی رسمی جملہ کہا جو انگریزی میں کہا جاتا ہے "مسرت ہوئی آپ سے مل کر"۔

اعجاز نے کہا "مسرت کھنچے جاتا ہے یہ کوئی سے نفیس ہیں بیگم نفیس کے میاں"۔

سراج واقعی جیسے چونک پڑا "اچھا۔ پھر تو واقعی مسرت ہوئی آپ سے مل کر"۔

اور واقعی میں نے دیکھا کہ بیچارے نفیس کی ذاتی حیثیت کچھ نہ تھی وہ صرف بیگم نفیس کا میاں تھا۔

نمک مرچ

اب بے چارے مرزا صاحب کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ اُن کے ذرا سے نمک مرچ لگانے کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ اسلم کی شادی مولوی صاحب کی لڑکی سے ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب بھی اُن کے دوست اور اسلم بھی اُن کے مرحوم دوست کی نشانی۔ اُن کا تو بس یہی جی چاہتا تھا کہ یہ شادی کسی طرح ہو ضرور جائے۔ چنانچہ انہوں نے اِدھر اسلم سے کہا کہ "صاحب زادے ذرا احتیاط سے جانا۔ بڑے دقیانوسی ہیں مولوی صاحب۔ بس نام ہی کے مولوی ہیں ورنہ اُن کے گھر کا سارا کارخانہ انگریزی ہے۔ میز پر کھانا وہ کھائیں۔ چھری کانٹے کے بغیر نوالہ حلق سے نہ اُترے۔ خود تو خیر مولویانہ انداز سے رہتے ہیں، مگر بیٹی کو نرسوں کی گود میں پروان چڑھایا ہے اور چاہتے ہیں کہ داماد بھی ملے تو صاحب بہادر ملے"
ادھر مولوی صاحب سے کہہ چکے تھے کہ "برادرم! لڑکے کو بُلا تو رہے ہو، مگر ایسا

نہ ہو کہ فرش پر دسترخواں بچھا کر بیٹھ جاؤ اُس کے سامنے، وہ لڑکا بچپن سے انگریزی ٹھاٹھ اٹھایا گیا ہے۔ ایک دانہ کشمش بھی کھاتا ہو تو چھری سے کھسکا کر کانٹے سے کھاتا ہے۔ ڈاکیئے تک سے بغیر سوٹ پہنے خط لینے باہر نہیں آتا بستر کی چائے وہ پیے۔ ناشتے کو بریک فاسٹ وہ کہے۔ کھانے کی جگہ لنچ اور ڈنر وہ کھائے۔ مطلب یہ کہ بنا بنایا انگریز سمجھو۔ اور دیکھ لینا کہ نوکری بھی اُس کو ٹھاٹھ ہی کی ملے گی۔ تو مطلب کہنے کا یہ تمہارے گھر کے یہ مولویانہ انداز دیکھ کر بھڑک نہ جائے کہیں"

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دونوں طرف جو یہ خبریں پہنچیں تو دونوں طرف انتظام بھی ویسے ہی شروع ہو گئے، اسلم بیچارے کے لیے مصیبت یہ تھی کہ تھوڑی بہت انگریزی پڑھی ضرور تھی مگر یہ حضرت اُن طالب علموں میں سے تھے جو دسویں درجے پہنچ کر انگریزی بال رکھنا شروع کرتے ہیں۔ بہت ~~تیزی~~ کی نکٹائی باندھنا سیکھ لیا۔ مگر چھری کانٹے سے کھانا تو ایک علیحدہ ہی فن ہے جو بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور اسلم بے چارے کو تو کبھی اس سے سابقہ ہی نہ پڑا تھا پھر یہ کہ احباب سے مشورہ جو کیا تو پتہ چلا کر ~~ان~~ کے کھانے کے لیے کچھ لباس بھی خاص قسم کا ہوتا ہے۔ ایک دوست نے وعدہ تو کر لیا کہ یہ لباس فراہم کر دیا جائیگا مگر اس غریب کو تو ابھی چھری کانٹے سے کھانے کی مشق کرنا تھی۔ چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا پریکٹس کے لیے ایک چھری خریدی۔ ایک کانٹا خریدا اور دونوں وقت کا کھانا اُسی چھری کانٹے سے شروع کر دیا۔ کہ چھری سے کاٹی روٹی۔ کانٹے سے بنایا۔ اُس کا

نوالہ اور پھر کانٹے سے وہ نوالہ اٹھا کر سالن کے پیالے میں ڈالا۔ اور اب وہ نوالہ منہ میں لے جاتے ہیں تو نوالہ گر کر واپس پیالے میں اور کانٹا رہا دانتوں سے کھٹاک سے پھر چھری کی مدد سے اُسے کانٹے میں پھنسایا اور ادھر اس کے خیر مقدم کے لیے نکالی پوری زبان۔ مگر نہ جانے نوالہ کیا ہوا البتہ کانٹا زبان میں چبھ کر رہ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ نوالہ آغوشِ شفقت میں پڑا قمیض کا ماس مار رہا ہے۔

ادھر یہ مشق جاری رہی تو اُدھر مولوی صاحب کا بُرا حال۔ کسی سے میز مانگ رہے ہیں تو کہیں سے کُرسیاں آ رہی ہیں۔ کسی گھر سے کھانے کے برتن چلے آ رہے ہیں تو کسی گھر سے چھُری کانٹے۔ ایک ہوٹل سے بیرا مانگ لیا تھا اور انگریزی کھانوں کا آرڈر دے دیا تھا گھر میں ایک ایک کو سمجھایا جا رہا تھا کہ خُدا کے واسطے یہ دیسی طریقے چھوڑ دو۔ وہ چند عزیز جو لڑکے کی آمد پر شریک طعام ہونے والے تھے اُن کو خاص طور پر ہدایتیں دی جا رہی تھیں کہ خبردار جو کسی نے کھانا کھانے میں یا کھانا کھانے کے بعد انگلی چاٹنے کی کوشش کی۔ اور خبردار جو کسی نے نلی کی ہڈی کا گُودا چُوسنا چاہا۔ مرزا صاحب کئی دن پہلے سے دن کے کھانے پر اسلم کو اور رات کے کھانے پر مولوی صاحب کو ریہرسل کرانے کی خدمت اپنے ذمے لے چکے تھے اور سچ پوچھئے تو یہ اُن ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ چند ہی دن میں مولوی صاحب کا ایسا ٹھیٹھ مشرقی آدمی کھانے کی میز پر بیٹھ کر چھُری کانٹے سے پلیٹ پر تاشہ بجانے میں ماہر ہو گیا تھا وہ باقاعدہ کُرسی پر

کر نیپکن اپنے زانو پر بچھا لیتے۔ اور چھری کانٹے سے ماحضر تناول فرماتے، یہ اور بات ہے کہ کھانے کے بعد نصف سے زیادہ نوالے نیپکن پر ڈھیر ملتے بہرحال مرزا صاحب کی ٹریننگ نے اتنا اثر ضرور کیا تھا کہ جب وہ پورا کھانا کھا چکتے تھے تو نصف پیٹ ضرور بھر جاتا تھا۔ اُدھر اسلم کو بھی اتنے دنوں میں یہ ترتیب یاد ہو گئی تھی کہ پہلے تلی ہوئی مچھلی اور آلو کھانا چاہئیں اور آخر میں پڈنگ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ مگر تلی ہوئی مچھلی اور آلو سے بھی پہلے جو سوپ پیا جاتا ہے اُس کی مشق اُسے کسی طرح نہ ہوتی تھی۔ وہ لاکھ ضبط اور احتیاط سے کام لے منہ سے "شڑپ" کی آواز ضرور نکل جاتی تھی۔ اس آواز کو دور کرنے میں مرزا صاحب کو بڑی محنت کرنا پڑی۔

بہرحال خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا کہ اسلم اپنے ایک دوست کا ڈنر سوٹ پہن کر اور اُسی سے ٹو بندھوا کر تختہ بنے ہوئے مرزا صاحب کے ساتھ مولوی صاحب کے درِ دولت پر دعوت کے لیے پہنچ گئے۔ جہاں مولوی صاحب بھی سیاہ شیروانی میں اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے اور اپنی عادت کے خلاف موٹا سا سگار اُن کے لبوں میں دبایا ہوا تھا مولوی صاحب نے اسلم کو دیکھتے ہی کہا۔

"اخاہ! یعنی میرا مطلب ہے ہلو! ہاں ٹھیک تو ہے۔ ہلو ہی کہنا چاہتا تھا میں"

اور اسلم نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر"

قبل اس کے کہ مولوی صاحب کچھ بولیں، اس لیے کہ وہ کچھ بولنے ہی والے تھے

مرزا صاحب نے کہا "مولوی صاحب! ہمارے اسلم میاں یوں تو خیر بچپن ہی سے انگریزی اٹھان اٹھائے گئے ہیں مگر ولایت نے تو ان کو بالکل ہی انگریز بنا دیا ہے"

مولوی صاحب نے خوشی سے سگار کا پورا کش لیکر کھانستے ہوئے کہا۔ اچھا اچھا تو گویا آپ بھی میری طرح ولائت رہ چکے ہیں۔ کہاں رہتے تھے آپ وہاں؟

اسلم نے گڑبڑا کر کہا۔ "جی ہیں۔ میں وہاں زیادہ تر وکٹوریہ ٹریس میں رہا ہوں"

مولوی صاحب نے کہا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے بڑی خوبصورت جگہ ہے۔

میں بھی شروع شروع میں وہیں رہا پھر۔ پھر۔ بھلا سا نام تھا اُس کا۔ ڈربی ریس ہاں ٹھیک تو ہے۔ ڈربی ریس میں رہنے لگا۔"

مرزا صاحب نے کہا "مولوی صاحب کا مطلب ہے ڈربی شائر سے"

اسلم نے کہا "جی ہاں میرا بھی اکثر آنا جانا رہتا تھا وہاں۔ وہ بھی بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ آموں کی فصل میں تو بڑا مزہ رہتا تھا وہاں"

مولوی صاحب نے مرزا صاحب کو بولنے نہ دیا۔ کیا کہنا ہے وہاں کے آموں کا اتفاق سے میرے گھر میں بھی دسہری کا ایک پیڑ تھا۔"

مرزا صاحب نے جلدی سے کہا "مولوی صاحب ہمارے اسلم میاں کھانے کے اوقات کے سختی سے پابند ہیں اور ان کے ڈنر کا وقت ہو چکا ہے"

مولوی صاحب نے گویا چونک کر کہا یقیناً۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ضرور ہونا چاہیے۔ وقت کا پابند یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے میں خود ٹائم ٹیبل کا اتنا پابند ہوں کہ میرے ہر کام کا وقت مقرر ہے"

اور پھر گلا صاف کر کے آواز دی۔ ابے میں نے کہا خدا بخش۔ یعنی میرا بیرا مطلب ہے۔ بیرا ئے"!

اور یہ آواز سن کر ایک باقاعدہ بیرا سر پر پگڑی اور کمر میں پٹی باندھے آ موجود ہوا۔ مولوی صاحب نے اُس سے پوچھا "کھانا تیار ہے"!

وہ ٹھہرا ہوٹل کا تربیت یافتہ بیرا اُس نے جواب دیا۔" جی صاحب میز لگا دی ہے"۔

مولوی صاحب نے ڈانٹنے کے انداز سے کہا۔ "تیار ہے میز تو بابا اسی کام کے لیے کھانے کے کمرے میں گھنٹی رکھی ہوتی ہے وہ بجائی ہوتی تم نے جاؤ، اب جا کر بجاؤ تاکہ ہم لوگ آئیں۔

مرزا صاحب نے قصہ کوتاہ کرتے ہوئے کہا۔ "چلئے صاحب بج گئی گھنٹی آؤ بھئی اکلم میاں"۔

یہ کھانے کا کمرہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مرزا صاحب خود اپنی نگرانی میں ٹھیک کرا کے گئے تھے۔ ورنہ دراصل یہ کمرہ ہے مولوی صاحب کا جس میں ایک طرف مولوی صاحب کی چارپائی ہوتی ہے جس کے قریب ہی حقہ رکھا رہتا ہے اور سارے کمرے میں جا بجا کوئلے بکھرے نظر آتے ہیں۔ ایک مگدر کی جوڑی رکھی رہتی ہے اور ڈنڑ پیلنے کے لیے دو سڈول اینٹیں اس لیے کہ مولوی صاحب ورزش کے ہمیشہ سے قائل ہیں۔ اسی کمرے میں ایک چوکی پر کچھ کتابیں بھی ڈھیر رہا کرتی ہیں اور ایک قلمدان۔ کونے میں ایک پانی کا گھڑا ہوتا ہے جس پر تانبے کا کٹورا اوندھا

نہ ملے۔ مگر آج یہ باقاعدہ ڈرائنگ روم بنا ہوا تھا۔ اور داد دینا چاہیئے۔ مرزا صاحب کو کہ پہچانا ہی نہ جاتا تھا یہ کمرہ۔

مولوی صاحب نے اسلم کو مقابل کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا "مجھے تو جب مرزا صاحب سے معلوم ہوا کہ تم بھی میری طرح رہن سہن میں انگریزیت کے دلدادہ ہو تو بخدا بڑی مسرت ہوئی۔ صاحب کوئی لاکھ کہے۔ مگر جو نفاست، باقاعدگی اور نظم انگریزیت میں ہے وہ ہماری معاشرت میں نہیں ہے۔ ارے بھئی مرزا صاحب! میں نے کہا دیکھ رہے ہیں۔ آپ ان ملازمین کی حرکت یعنی ان بیہودوں نے جھاڑنیں گلاسوں میں سجائی ہیں۔ جھاڑنوں کے گلدستے سجائے ہیں، احمقوں نے! کوئی پوچھے کہ پانی آخر کوئی کس میں پئے گا؟"

پگڑی اور پیٹی باندھے ہوئے بیرا تو منہ پر جھاڑن رکھ ہنستا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ مگر مرزا صاحب نے گڑبڑا کر کہا "ہمارے مولوی صاحب بذلہ سنج ہیں قیامت ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ روز آپ کی میز پر یہی دیکھتا ہوں کہ بیرا نیپکن اسی طرح سجاتا ہے آج نہ جانے آپ کو یہ مذاق کیوں سوجھ گیا" اور یہ کہہ کر اب جو مولوی صاحب کو گھورا ہے تو وہ ہنس کر بولے..... بھئی اس طرح ہنس بول کر بہت سی کاٹ لاتے ہیں۔ باقی بھی کٹ جائے گی" اور اسی وقت سوپ میز پر آگیا اس عرصہ میں مرزا صاحب سوپ پینے کی مشق اسلم اور مولوی صاحب دونوں کو کرا چکے تھے پھر بھی مولوی صاحب کی داڑھی پر ٹپکے ہوئے سوپ کے موتی جگمگائے بغیر نہ رہ سکے۔

مگر مرزا صاحب کے اشارے پر مولوی صاحب نے تمکین سے اُن کو صاف کر کے کہا "اظہر میاں ہیرے میاں کا تو یہ حال ہے کہ بجائے زیادہ دن بچے اس طرز معاشرت کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ بعد اگر چمچہ ملے تو کیا جانے کہا سے ہیں بھیگی ہوئی ڈبل روٹی اُن کے حلق سے اُترجاتی ہے۔"

مرزا صاحب نے گفتار سنتے ہوئے مولوی صاحب کو گھورا تو وہ بولے "میرا مطلب یہ ہے کہ بچے کیسے بے حد عادی ہیں بلکہ گویا اُن کی گھٹی میں انگریزیت پڑ چکی ہے۔ اس اٹھان اٹھنے والے بچوں کا دیسی گھر میں گزر ہو سکتا ہے جیسے یہی معاشرت ہو۔"

ادھر اظہر کا یہ حال کہ مچھلی اور آلو غلط کانٹے میں جو مخلوط میں تھا مسلسل کوشش میں پلیٹ پر چلتے نکالے جانے میں مصروف تھے کہ آلو کا ایک موٹا سا قتلا چھری کے نیچے سے پھسل کر اس جوار سے تو گھبراہٹ میں کانٹا بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بغیر اس بات کو تو مرزا صاحب پی گئے اور مولوی صاحب کو باتوں میں لگا لیا۔ مگر جب پلیٹ سے اڑا ہوا آلو کا قتلا اظہر نے میز سے اٹھا کر پھر کانٹے میں پھنسایا تو ہیرے نے پھر منہ پر چھاتی رکھ لیا۔ مولوی صاحب بدستور اپنے بچوں کی انگریزیت کی داستان سنا رہے تھے کہ اُن کے قریب ہی سے آواز آئی نہایت بحر طویل میں "آبا ــــ آ ــــ آ ــــ" اور اب جو سب دیکھتے ہیں تو ایک نہایت گھناؤنا سا بچہ جس کا سر منڈا ہوا ہے نہایت بدتمیزی سے مولوی صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا

بڑھا کر اور پاس چلے۔ مولوی صاحب نے نہایت تلخی سے اُس کو دیکھ کر دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی یہ کس کا بچہ آگیا یہاں؟" اور بچہ پھر اُن کی طرف ہاتھ پھیلا کر چیخا،

"ابّا ـــ اُ ـــ اُ ـــ آ ـــ"

مولوی صاحب نے گھبرا کر کئی مرتبہ لاحول پڑھ کر نیپکن سے اُس کا منہ صاف کرتے ہوئے کہا "یہ بے بی کی آیا کا بچہ ہے اور نامعقول ابا مجھ ہی کو کہتا ہے۔"

ایک دم چلمن کے پیچھے سے آواز آئی۔ "بھاڑ پڑے اس موئی انگریزیت کو کہ اپنا بچہ بھی آیا کا کہا جا رہا ہے۔"

مولوی صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور گڑبڑا کر بولے: "بیچاری کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ دن رات اسی طرح بکا کرتی ہے۔" آیا ہے بے بی کی چلمن کے پیچھے سے پھر آواز آئی "تو اور سنو میں بھی آیا ہو گئی۔ اتنا ہی خیال تھا تو جہاں کرائے کی سب چیزیں منگائی تھیں، بیوی بچے بھی منگا لیے ہوتے۔ میں پوچھتی ہوں آخر ہاتھی دانت دکھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہی مثل کہ پوچھا نائی رے نائی بال کتنے اُس نے کہا ابھی سامنے آتے ہیں۔ یہ بھانڈا آخر کب تک نہ پھوٹے گا۔ سو باتوں کی ایک بات یہ کہ اگر صاحبزادے ایسے ہی انگریز ہیں تو ہماری لڑکی کا نباہ اُن سے مشکل ہے۔"

مولوی صاحب کرسی سے اُچک کر کمرے میں چلے گئے اور ادھر اسلم نے

موقع غنیمت جان کر جو کچھ ہاتھ لگا جلدی جلدی ہاتھوں سے کھانا شروع کر دیا۔ بیرے کے منھ پر مسلسل جھاڑن رہی۔ مرزا صاحب سر جھکا کر جو بیٹھے تو سر اٹھایا ہی نہیں اور اطمینان سے جیسے راجہ پورس اپنے اُس ہاتھی سے باز پرس کرتا رہا جس نے اپنی ہی فوج کو روند ڈالا تھا کہ یکایک اندر سے تین چار پٹاخ پٹاخ کی آوازوں کے بعد ایک عورت کے رونے کی ایسی آواز آئی کہ مرزا صاحب چھڑیاں نہ چھوڑ سکے مگر اسے ہضم کرتا ابھی پیٹ تنگ ہی کھلا تھا!

بیوی سلام کہتی ہیں

"بیوی سلام کہتی ہیں"

یہ آٹھواں سلام تھا جو یہ لڑکی لے کر آئی تھی۔ اب میری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ جب سے اس مکان میں آیا ہوں میری حیثیت عجیب "وعلیکم السلام" کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اگر صبح ہے تو "بیوی سلام کہتی ہیں" اور شام ہے تو بیوی سلام کہتی ہیں" معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلام مجھ سے یہ گھر بھی چھڑوا دیں گے

مدت کی خانہ بدوشی کے بعد جب یہ گھر مجھ کو کرایہ پر ملا تو میں نے سجدۂ شکر ادا کیا کہ چلو ہم بھی گھر والے کہلائے تو سہی۔ اس مکان کی مالکہ ایک بیوہ ہیں جو خود اوپر کے حصے میں رہتی ہیں۔ اور مکان کے نیچے کا حصہ ابھی پرسوں ہی میں نے کرایہ پر لیا ہے چنانچہ پرسوں جب میں اپنا سامان لے کر آیا اور یہ سامان مختلف کمروں میں قرینے سے لگا رہا تھا میں مصروف تھا کہ ایک خوشنما گیارہ بارہ برس کی سی لڑکی دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی اور

اپنے بال گھونگھٹ کے انداز سے کھجا کھجا کر جب میرے تمام جسم میں کھجلی سی پیدا کر چکی تو کہنے لگی ـــــــ

"بیوی سلام کہتی ہیں"

میں نے پوچھا "کون بیوی؟"

اس نے اپنا میلا سا دوپٹہ چباتے ہوئے کہا "مکان کی مالک اور کون"

میں سمجھ گیا کہ مکان کی مالکہ نے سلام اس لیے کہلوایا ہے کہ میں نے کرایہ نامہ ابھی تک نہیں بھرا چنانچہ میں نے اس لڑکی سے کہہ دیا "ہاں ٹھیک ہے تم میرا بھی سلام کہہ دینا اور کہنا کہ آج اتوار تھا اس لیے کرایہ نامہ نہیں بھرا ہے کل ضرور بھر دوں گا۔

وہ اپنے بال نوچتی کھسوٹتی چلی گئی اور میں اپنا سامان مختلف کمروں میں سجاتا رہا۔ لکھنے پڑھنے کے لیے جو کمرہ منتخب کیا تھا اس میں کتابیں قرینے سے رکھ دیں۔ لکھنے کی میز لگا دی میز پہ لکھنے کا سامان سجا دیا سونے کے کمرے میں بستر ٹھیک کر دیا۔ بستر کے قریب ایک میز پہ ٹیبل لیمپ اور چند خواب آور گولیاں اور اسی قسم کا دوسرا سامان رکھ دیا۔ مختصر یہ کہ رات گئے تک یہی رکھا اٹھایا کرتا رہا چنانچہ صبح دیر سے اٹھا اور سیدھا دفتر چلا گیا دفتر سے واپسی میں گول کمرے کے لیے کچھ سامان لیتا ہوا واپس آیا مگر وہ کرایہ نامہ میں پہلے ہی بھر چکا تھا اس لیے کہ دفتر جاتے ہی چپراسی بھیج کر سرکاری کاغذ منگا لیا تھا۔

چنانچہ گھر پہنچ کر ابھی میں ہاتھ منہ دھو کر غسل خانے سے نکلا ہی تھا کہ وہی نابکار لڑکی بجائے اپنے سر کے میرے کمرے کا دروازہ کھجاتی ہوئی نظر آئی اور اس نے مجھ کو دیکھتے ہی کہا ـــــــ

"بیوی سلام کہتی ہیں"

میں نے کہا "اچھا ٹھہرو میں دیتا ہوں ابھی کرایہ نامہ"

چنانچہ کرایہ نامہ رپورٹ فولیو سے نکال کر اس کے حوالے کیا اور وہ "قابلِ توجہ محکمہ حفظانِ صحت" کی دفع ہوئی تو پہلے گول کمرے کی ترتیب شروع کر دی پردے لگائے صوفے ٹھیک کئے۔ ریڈیو رکھا۔ غسل خانے کا جو سامان ابھی بازار سے لے کر آیا تھا وہ قرینے سے سجایا۔ سجا کر اس کو دور سے جا کر دیکھا پھر نزدیک آ کر دیکھا سنہری جلدوں والی کتابوں کی الماری ایک کونے میں رکھ کر اس پر گلدان رکھ دیا اور شام تک گول کمرہ دلہن کی طرح سجا دیا۔ اب باری تھی کھانے کے کمرے کی اور کھولنا تھے برتنوں کے بکس، مگر ابھی میں یہ ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہی جان لیوا لڑکی پھر موجود۔ اس نے اپنی ہتھیلی پر رکھا ہوا چورن ذرا سی زبان نکال کر چاٹتے ہوئے کہا ——

"بیوی سلام کہتی ہیں"

اور میں فوراً سمجھ گیا کہ اس سلام کا مقصد یہ ہے کہ کرایہ دلواؤ چنانچہ میں نے اس سے ——

"اچھا ٹھہرو میں دیتا ہوں کرایہ"

اور جیب سے پرس نکال کر کرائے کی پوری رقم اس کے حوالے کر دی۔ وہ مٹھی میں نوٹ دبا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا ہوا چورن چاٹتی چلی گئی اور ابھی میں نے برتنوں کے بکس کھولے ہی تھے کہ اس نے باقاعدہ رسید لا کر مجھے دے دی اور چلی گئی۔ اس کے

جانے کے بعد ہی سے کھانے پکانے کو ٹھیک کیا، الماریاں بھی برتن سجائے، سائڈ
بورڈ ٹھیک کیا۔ کھانے کی میز پر اجلا کپڑا بچھایا۔ نمکدان قرینے سے لگائے کرسیاں ترتیب
سے بچھائیں اور آج پھر دیر تک جاگ کر سارا گھر ٹھیک کر دیا۔ اطمینان یہ تھا کہ کل تو چھٹی
لے ہی رکھی ہے دیر تک سوتے رہیں گے، مگر یہ سارا ارمان بھی پورا نہ ہو سکا۔ صبح
اچانک آنکھ کھل گئی اور آنکھ کھلتے ہی تکیہ کو لا حول پڑھ کر پھر بند کر لی۔ بات یہ ہے کہ میں ایسی
معاملے میں ذرا وہمی واقع ہوا ہوں کہ صبح اٹھ کر میں کوئی نحس چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس
لیے کہ تجربہ کچھ اس قسم کا ہے کہ اگر کوئی نامبارک چہرہ صبح نظر آ گیا تو سارا دن نہایت بُرا
گذرتا ہے۔ بعض چہرے تو واقعی ایسے نحس ہوتے ہیں کہ اگر صبح ان کی زیارت ہو جائے تو
ممکن ہے کہ دن بھر کھانا بھی نہ ملے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ نہ جانے اور کیا مصیبت
آ جائے۔ میرے پاس اسی قسم کا ایک ملازم تھا جس کے ڈر کے مارے میں اپنے کسی
نہ کسی بچے کی تصویر سرہانے رکھ کر سویا کرتا تھا کہ آنکھ کھلتے ہی اس کو دیکھ لیا کروں گا۔ وجہ
یہ تھی کہ ایک دن آنکھ جو کھلی تو یہی حضرت کھیسیں نکالے منہ کے سامنے کھڑے تھے۔
دل کو تو اسی وقت کچھ یقین سا ہو گیا کہ آج خیر نہیں ہے، چنانچہ اسی دن دفتر جاتے ہوئے
سائیکل کے پہیے میں پنکچر ہوا۔ دیر سے دفتر پہنچنے پر اپنے ایک افسر سے ذرا الجھن سی ہو گئی
دفتر سے واپسی پر ایک دوست کے ساتھ رمی کھیلنے جو بیٹھے تو جیب ہی صاف ہو گئی
بلکہ کچھ قرض لد گیا۔ اور اسی کھیل میں ایک دوست کی بے ایمانی جو پکڑی تو ان سے زندگی
بھر کے لیے تعلقات خراب ہو گئے۔ اور جب شام کو ان تمام حالات پر غور کیا تو

اسی نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوا ہے کہ خیراتی کا منہ دیکھ کر اُٹھے تھے، کچھ دن بعد پھر ان حضرت کی زیارت ہو گئی چنانچہ پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ نہایت نجیب الطرفین الیشین کتا ایک موٹر کی زد میں آ کر داغِ مفارقت دے گیا پھر ان موٹر والے صاحب سے ایسا جھگڑا ہوا کہ باقاعدہ مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔ اور ہاں ٹھیک تو ہے۔ اسی دن کا یہ واقعہ بھی تو ہے کہ کتے کے کچلنے کی خبر سن کر پتلون پر استری چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور واپسی پر پتلون ہی نہیں بلکہ میز کا کپڑا اور میز کی لکڑی تک جل چکی تھی بہر حال اس دن کے بعد سے توبہ کی تھی کہ خواہ زندگی بھر سونا ہی پڑے اور آنکھ کھولنے کی نوبت نہ آئے مگر آنکھ کھول کر اس مردود خیراتی کا منہ کبھی نہ دیکھیں گے شروع شروع میں تو یہ کیا کہ صبح نیند سے تو بیدار ہو گئے مگر آنکھ نہیں کھولتے اور آنکھ بند کئے کئے پوچھ رہے ہیں ——

”ارے بھئی خیراتی تم ہو تو نہیں کہیں آس پاس؟“

اگر جواب نہ ملا تو آنکھ کھول دی اور اگر وہ اتفاق سے موجود ہوئے اور بامے متعدی لہکے لپکے اس آواز پر تو آنکھیں بند کئے کئے ان کو کسی کام سے بھیج کر آنکھیں کھول دیں۔ بہر حال یہی صورت اس وقت بھی تھی بلکہ یہ نامعقول اٹکل تو خیراتی سے بھی زیادہ خوف ناک تھی۔ چنانچہ اس کو دیکھتے ہی دل دھک سے رہ گیا کہ الٰہی خیر! یہ کم بخت نظر آگئی نہ جانے کیا ہونے والا ہے آج۔ اور وہ بدستور فرش پر بیٹھی کھٹا کھٹ گٹکے کھیلتی رہی۔ مگر آپ پڑے رہتے اور آنکھیں بند رکھنے سے کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ اس

کو نظر آتا تھا چنانچہ وہ نظر آ چکی تھی لہٰذا سیکڑوں وہم تھے سب جاتے رہتے ہیں تو اس نے کہا

"بیوی سلام کہتی ہیں"

مجھے تو یہ وہم کچھ عید کا خطرہ ہم سے لیجئے جو خدا کی سمجھ میں آیا ہو کہ اب اس سلام کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ بستر پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور دیر تک غور کرتے رہے کہ اس سلام کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ آخر بات سمجھ میں آ ہی گئی کہ ان محترمہ سے یہ طے ہو چکا ہے کہ کرایہ کے علاوہ بجلی کا آدھا بل بھی ادا کرتے رہیں گے اس لیے کوئی عذر معقول نہیں ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"دیکھو بیوی سے میرا سلام بھی کہہ دینا اور کہہ دینا کہ بجلی کا بل تو مہینے کے بعد دینا ہوگا یا ابھی سے میں کس حساب سے دے سکتا ہوں۔"

وہ زمین کے فرش سے اٹھ کر کپڑے جھاڑتی روانہ ہو گئی حالانکہ زمین اس کے کپڑوں کا کیا بگاڑ سکتی تھی البتہ اس کے کپڑوں ہی سے زمین کو میلا ہونے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال اس کے جانے کے بعد میں آنے والے حادثوں کے وہم میں مبتلا غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ آج ذرا تفصیل سے غسل کیا اس لیے کہ گھر ٹھیک ہو چکا تھا اور نہانے میں جلدی کی ضرورت بھی نہ تھی دفتر سے تو چھٹی لے ہی رکھی تھی۔ بہرحال جب نہا دھو کر غسل خانے سے نکلے تو دیکھتے کیا ہیں کہ مسعود اور اختر بھی چلے آ رہے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا

"ارے بھئی تم دونوں کہاں، دفتر نہیں گئے؟"

اختر نے کہا۔ "تم خانہ آبادی کی حسرت خود کیا دیتے تھے ہم نے کہا لو آج ہم بھی چھٹی لے بیٹھے۔ اختر نے گھر کے مختلف کمروں کا معائنہ کرنے کے بعد واپس آکر کہا۔
"مکان تو ٹھاٹھ کا ہے اور بڑے نصیبہ ور ہو کہ اس زمانے میں ایسا مکان مل گیا مگر یہ سانچے کا مکان سانچے کی ہانڈی سے مختلف نہیں ہوتا۔ خصوصاً ساجھی مالک مکان کا۔"

مسعود نے سرگوشی کے انداز سے کہا۔ "مالک مکان نہیں مالکہ مکان۔"
اختر نے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا، "اچھا، یہ بات ہے پھر تو بھئی مہک"
اور اسی وقت وہ شامت اعمال پھر نمودار ہوئی۔

"بیوی سلام کہتی ہیں"
مسعود نے کھنکار کر اختر کو دیکھا اور اختر نے اس لڑکی کو سر سے پیر تک کئی بار دیکھ کر میری طرف نظر اٹھائی تو میں اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"بھئی کہہ تو دیا ہے کہ بجلی کا بل جب آئے گا تو ادا کر دوں گا۔ آخر اب کیوں آئی ہو۔ پوچھ کر آؤ کہ بات کیا ہے آخر؟"
وہ تو چلی گئی مگر ان دونوں مسخروں کو ایک موضوع مل گیا تھا اس کے جاتے ہی مسعود نے کہا۔

"سنا بھئی اختر! بیوی سلام کہتی ہیں"
اختر نے کہا "اور آپ کی حماقت ملاحظہ ہو کہ بجلی کا بل لے دوڑے۔ میاں اس

قسم کے سلاموں کا بھی بھلا یہ جواب دیتا ہے کوئی کس قدر لطیف سلسلہ جنبانی ہے

تمہیں ہماری امنگیں سلام کہتی ہیں ؏

میں نے کہا۔ گھاس کھا گئے ہیں آپ خود وہ بڑی خرافات قسم کی کاروباری عورت ہے۔ پہلا سلام کہلوایا تھا جس کا مطلب تھا کہ کرایہ نامہ بھر دو پھر سلام کہلوایا مطلب یہ تھا کہ کرایہ پیشگی دو، جب کرایہ بھیج دیا تو اب سلام کہلوایا ہے کہ بجلی کا آدھا بل بھی ادا کرو۔"

مسعود نے الجھ کر کہا "اچھا بابا تم ہی ٹھیک کہتے ہو ہمیں کیا مطلب تمہارے سلاموں سے۔ تاش کہاں ہیں؟"

میں نے الماری سے تاش کی گڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں، نمبر لکھنے کو قلم اور کاغذ بھی دے دیا مگر جیسے ہی پہلا ہاتھ بٹا ہے ایک دم خیال آیا کہ صبح کس کا منہ دیکھ کر اٹھے ہیں اور طے کر لیا کہ آج خیریت نہیں ہے، چنانچہ جب پتے اٹھا کر دیکھتے ہیں تو تیرہ پتوں میں سو سے زیادہ نمبر لیے بیٹھے تھے، نہ جوکر کا پتہ تھا اور نہ کوئی پتہ کسی سے ملتا تھا دل دھڑکنے لگا کہ خدانخواستہ اس وقت کسی نے ڈکلیر کر دیا تو مارے گئے بے موت مگر اسی وقت اختر نے کہا۔

"پھر سے بانٹو میرے پاس چودہ کارڈس ہیں حالانکہ جوکر بھی ہے اور سلسلہ بھی بنا ہوا ہے۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کر کے جلدی پتے پھینک دیئے۔ مسعود نے پھر پتے

پھر پھر اسے گراہی باندھنا شروع کر گئے تھے کہ ہم تینوں اس آواز پر چونک پڑے۔

"بیوی سلام کہتی ہیں"

میں نے غصے سے اس لڑکی کو دیکھا ہی تھا کہ اس نے ایک پرچہ بڑھا دیا۔ میں نے پرچے کو پڑھا جس میں لکھا تھا "معاف کیجئے گا آپ کو غلط فہمی ہوئی میں نے بجلی کا بل ادا کرنے کو نہیں کہا تھا بلکہ اس سے کہلوایا تھا کہ اگر آپ کی کتابوں میں دیوان غالب ہو تو تھوڑی دیر کے لیے مجھے بھجوا دیجئے۔"

میں نے پرچہ مسعود اور اختر کے سامنے کھلا ہوا چھوڑا اور کتابوں کی الماری سے دیوانِ غالب نکال کر لڑکی کو دے دیا۔ اس کے جانے کے بعد اختر نے کہا۔

"بھئی چچا میرے مجھ سے قسم لے لو یہ دیوان غالب محض بہانہ ہے"

مسعود نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں۔"

اختر نے وہ پرچہ دیکھتے ہوئے کہا "اور یہ تو دیکھو القاب کی جگہ صرف بیگم"

مسعود نے کہا "بھئی وہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔ مگر خط کتنا پاکیزہ ہے"

اختر نے کہا "اور ذوق کے متعلق کیا خیال ہے۔ دیوانِ غالب منگایا ہے جناب"

میں نے کہا "اچھا خیر تاش بانٹئے۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا"

مسعود نے تاش بانٹے تو حیرت ہوگئی تقریباً ویسے ہی پتے اور اسی پہلے ہاتھ کے سے لگ بھگ بے شمار نمبر، جو کر نہ لمڑ ادھر ایک سے ایک افضل پتہ جوڑ پایا۔ اس پر قیامت یہ آئی کہ دوسرے ہی دور میں مسعود نے پتے بنا کر میز پر رکھ دیئے۔ مجھے

چکر سا آگیا۔ ادھر میں نے سے نمبر لکھوا دیئے پچیانوے۔ دوسرے ہاتھ میں پچھتر نمبر دیئے اور تیسرے ہاتھ میں باون۔ نتیجہ یہ کہ ایک گھنٹے کے بعد پانچ سو سے زیادہ نمبر لادے بیٹھے تھے کہ اس لونڈیا نے پھر آ کر کہا

"بیوی سلام کہتی ہیں"

میں نے غصے سے کہا "اور کیا کہتی ہیں کچھ بتا بھی چکو۔ سلام تو ہو ہوئے مصیبت ہو گئے"

اس نے ایک پرچہ آگے بڑھا دیا۔ میں نے پڑھا لکھا تھا، "اگر آپ فارغ ہو لیں تو چند منٹ کے لیے میری ایک بات سن جائیں" میں نے لڑکی کو تو رخصت کر دیا اور پرچہ مسعود اور اختر کو دکھایا تو وہ دونوں آپس میں ہاتھ ملانے لگے۔ مسعود نے تاش ایک طرف رکھ دیئے اور نمبروں کے کاغذ پر حساب لگا کر میرے ذمے بتیس روپے نو آنے لکھ کر کہا "یہ تم کو دینا ہیں اور اب تاش ختم، ہم کسی کی راہ میں مخل ہونا نہیں چاہتے" اختر نے بھی اس کی تائید کی۔

مسعود نے پھر کہا "اب وہاں ذرا آدمیوں کی طرح جانا اور اپنے کو بہت گرا پڑا بھی ثابت نہ کرنا۔"

میں نے کہا "تم دونوں ذرا ٹھہرو میں جا کر ذرا دیکھوں تو سہی بات کیا ہے"؛

اور دونوں کو چھوڑ کر میں باہر جیسے نکلا تو وہ لڑکی پھر اسی طرف آ رہی تھی

"بیوی سلام کہتی ہیں"

میں نے کہا، "چلو میں خود وعلیکم السلام کہوں گا ان کے پاس جاکر۔"

اور اب جو میں اوپر پہنچا ہوں تو نہایت خوفناک آواز آئی۔ "آجاؤ اندر آجاؤ۔ اب تم سے کیا پردہ میرے بچوں کے برابر ہو تم۔"

ایک تو یہ آواز ہی کافی تھی اس کے بعد جب مالکہ مکان کو دیکھا تو وہ خود اگلے وقتوں کی عمارت واقع ہوئی تھیں۔ ان سے الٹی سیدھی دو چار باتیں کر کے جو میں بھاگا ہوں اور مسعود اور اختر کو جو یہ خبر سنائی ہے تو وہ بھی سر پڑ گئے۔ مسعود نے حیرت سے پوچھا۔

"اتنی سی دیر میں آپ ہار گئے اور یہ ہار جو ابھی ہوئی ہے وہ سب ہاروں کی ہار۔ آج کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے!"

اور مجھے پھر وہ نامعقول لڑکی یاد آگئی۔ صاحب میں اس مکان میں نہیں رہ سکتا۔

غُربا کشتن روزِ اول

اب جب وہ آئینہ خانہ سے بال بال موتی پرو کر اور سولہ سنگھار کر کے برآمد ہوئیں تو میں اس طرح سر پکڑ کر بیٹھ گیا گویا ؎

اُن کی تصویر سامنے رکھ کر
اپنا انجام سوچتا ہوں میں

اور واقعی میں اُس وقت اپنا انجام سوچ رہا تھا۔ مگر میں آپ سے کیا کہوں بلکہ خود ستائی کا عادی نہیں ہوں۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ بہت ہی کم شوہر ہوتے ہیں جو اس قسم کے نازک موقع پر اپنے کو سنبھال سکیں اور اپنے اور بیوی کے درمیان عقل کو لا سکیں۔ ورنہ تاریخ شاید ہے کہ جہاں ایک چاہنے والا میاں اور ایک خوبصورت بیوی ہوتی ہے وہاں عقل آس پاس کہیں نظر نہیں آتی۔ اور عقل کا دخل ہو جائے تو کچھ سمجھئے کہ ان دونوں کے درمیان یا تو عنقریب طلاق کی نوبت آنے والی

ہے۔ بالتعلقات میں اتنی بے تکلفی موجود ہے کہ طلاق کی بھی ضرورت نہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ البتہ جھوٹ کیوں کہوں اب اتنی محبت بھی نہیں کہ خود اپنے سے زیادہ اپنی بیوی کو چاہنے لگوں۔ ورنہ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ مجھ کو اس کا شوق نہ ہوگا کہ میری بیوی کے رخسار غازے سے گلاب کا پھول بنے ہوئے نظر آئیں۔ لپ اسٹک سے لبوں پر وہ عالم ہو کہ خود اپنے لیے انجمن ہلالِ احمر کی ضرورت پیش آجائے۔ ناخنوں پر نیل پالش دیکھ کر خود اپنے ہی خونِ ناحق کا گمان گزرے۔ مگر ان ہی انتہا آزما نقشوں کو دیکھ کر میں عقل سے کچھ ایسا کام لے گیا کہ مجھ کو اپنی عقلمندی پر خود حیرت ہے اور جی چاہتا ہے کہ اپنی اس ذہانت پر خود ہی اپنی شان میں ایک قصیدہ کہہ کر سنہری فریم میں لگوا کر اپنے کمرے میں ٹانگ لوں۔

اُن کو حیرت ہوئی کہ مجھے یک دم آخر ہو کیا گیا۔ غالباً پہلے تو یہ شبہ ہوا کہ اُن کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے میں نے نظر اپنی نیچی کر لی ہے۔ پھر خیال آیا ہوگا کہ تابِ نظارہ نہ لا کر شاید میں چکرا گیا ہوں، مگر آخر کب تک جب دیر تک میں اسی عالم میں گم صُم بیٹھا تو آخر اُن کی آواز نکلی۔

”یہ آخر ہو کیا گیا ایک دم سے؟“

میں نے اپنی دبی ہوئی گردن ذرا اٹھا کر بدستور بجھے بجھے انداز سے کہا۔

”کچھ بھی نہیں۔“

اب وہ واقعی پریشان ہو گئیں — طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

میں نے گویا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔"

انھوں نے قریب آکر پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا عورتیں عام طور پر نبض ملتے ہی پر دیکھتی ہیں پھر قریب بیٹھ کر بڑی دلسوزی سے پوچھا: "واقعی بتلایئے تو سہی۔ بات کیا ہے آخر؟"

میں نے بڑے غصے سے کہا۔ "خواہ مخواہ بھی۔"

اب وہ مصر ہو گئیں۔ "ضرور کوئی بات ہے۔ اس قدر خاموش تو کبھی میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔ آپ کو میری قسم بتایئے نا بات کیا ہے؟"

میں ایک دم گھبرا کر کھڑا ہو گیا اس لیے کہ اُن کے کپڑوں سے عطر کی جو بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اُس کے بعد اس اداکاری کے امکانات ختم ہی ہونے والے تھے۔ بہرحال اس شدید امتحان سے بھی میں اپنے کو نکال لے گیا۔ اور میں نے ٹہل کر دو تین ایسی سانسیں کھینچیں کہ وہ واقعی سہم سی گئیں اور بڑے تعجب کو غور سے دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ اپنے اُس ہاتھ میں لے لیا جس کے ناخنوں پر نئی طرز کی نیل پالش لگا ہوا تھا۔ اور قبل اس کے کہ میرا ہاتھ اپنا ہاتھ ان سے کھینچ بیٹھے انھوں نے کہا۔

"بھئی اللہ آخر بتاتے کیوں نہیں آپ کہ بات کیا ہے؟"

اور میں نے پھر ایک دم عزم راسخ سے کام لے کر اپنے آپ کو سنبھالا کہ بس اُستاد یہی وقت ہے ذرا سنبھلنے کا۔ پھر ڈیرا پا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک

اور اُلجھی ہوئی تمام کمال اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر بڑی یاس انگیز نظروں سے اُن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ اعتماد جو میرے اور آپ کے درمیان تھا آج اُٹھ گیا۔"

باوجودیکہ آپ کے اُن کے چہرے کا رنگ ایک دم اُڑ گیا۔ اور وہ سہمی ہوئی آواز میں بولیں — "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے بدستور سنگدلی سے کام لے کر اُن کے نازک دل پر ٹھیس لگائی "میں سچ کہہ رہا ہوں کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا اور ہم دونوں کے درمیان میں جو سچائی تھی وہ ختم ہو چکی"

وہ حیرت سے بولیں۔ "کیا میں نے کوئی جھوٹ بولا آپ سے؟"

میں نے گردن ہلا کر کہا — "جی ہاں۔ جھوٹ۔ اور ایسا جھوٹ جو بہت ہی روشن ہے"۔

اب وہ اپنے عورت پن پر اُتر آئیں — "خدا مجھے اُس دن کے لیے موت ہی دے دے کہ میں آپ سے جھوٹ بولوں۔"

میں نے کہا۔ "ممکن ہے آپ نے دانستہ جھوٹ نہ بولا ہو مگر جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے۔ اور میرے اور آپ کے درمیان موجود ہے"۔

وہ عاجز آ کر بولیں۔ "تو آخر بتلا دیجئے نا وہ کیا ہے"۔

میں نے اور بھی سخت بات بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر کہی ۔ "آپ نے میری محبت

کا مذاق اُڑایا ہے۔"

اب وہ رو دینے کے قریب ہو کر بولیں۔ "ہائے اللہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جس محبت پر مجھ کو ناز ہے میں بھلا اُس کا مذاق اڑاؤں گی"

میں نے نہایت روانی کے ساتھ کہا۔ "آپ نے خود اپنی بھی توہین کی ہے نہ صرف مجھ کو ناقابلِ اعتماد سمجھا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ خود بھی اپنے متعلق آپ کو اعتماد باقی نہیں رہا ہے۔ آپ احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور آپ مجھ کو بھی نہایت پست سمجھ بیٹھی ہیں"

اب ان کو طرح طرح کے شبہے ہونے لگے۔ اپنے لب ہائے رنگین پر کیوٹکس لگی ہوئی انگشتِ شہادت رکھ کر پہلے کچھ غور کرتی رہیں۔ پھر ایسی عجیب نظروں سے مجھ کو دیکھا کہ الاماں والحفیظ۔ قریب تھا کہ میں ہنس کر اُن کو بھی ہنسا دوں کہ مجھے اپنا مجاہدہ یاد آ گیا اور دل نے کہا کہ برخوردار آج ڈگمگائے تو پھر زندگی بھر نہ سنبھل سکو گے۔ لہٰذا میں نے ان کو دیکھنا چھوڑ دیا۔ ذرا غور کیجیے کہ یہ کتنی بڑی نفس کشی ہے کہ کوئی اپنی میک اپ کی ہوئی بیوی کو نہ دیکھے۔ اُدھر وہ اس بے رخی کی تاب نہ لا کر بولیں۔ "اگر آپ سے کسی نے کچھ کہا ہے تو پہلے مجھ سے میرا جرم تو بیان کر دیجیے"

میں نے کہا۔ "آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے خلاف کسی سے کچھ سننے کو تیار نہیں ہو سکتا مگر جب خود ایک بات دیکھوں تو اپنی آنکھوں کو کیسے پھوڑ لوں"

مجھے خود بھی اندازہ ہوا کہ یہ بات میں بہت سخت کہہ گیا۔ چنانچہ اس کے بعد

مجھ کو تفصیل میں جانا ہی پڑا اور میں نے ٹھہرے ہوئے دھیمے انداز سے کہنا شروع کیا۔

"آپ خود آئینے کے سامنے چلی جائیے۔ آپ کا آئینہ آپ کو خود بتا دے گا۔ کہ آپ نے مجھ سے کیا جھوٹ بولا ہے۔ اپنے آئینے سے پوچھیئے گا کہ آپ کس حد تک احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ آپ ہی کا عکس میری تائید کرے گا کہ ہم دونوں کے درمیان جو اعتماد تھا اب نہیں ہے۔

انھوں نے گھبرا کر کہا۔ "آپ سے اتنی باتیں سننے کے بعد میرا دماغ اب اس قابل نہیں ہے کہ میں ان معموں کو حل کر دوں۔ خدا کے واسطے مجھے صاف صاف بتا دیجئے کہ مجھ سے کیا غلطی ہو گئی ہے جس نے آپ کو اتنا دکھ پہنچایا ہے۔"

اب میں نے براہِ راست سوال کیا۔ "آپ نے کس ضرورت سے یہ پاؤڈر لگایا ہے۔ اس غازے کے پردے میں اپنے اُن رُخساروں کو کیوں چھپایا ہے آپ نے جن پر ہمیشہ ایک صداقت کی چمک دیکھ دیکھ کر میں جھوما کرتا تھا۔ اس لپ اسٹک سے اُن لبوں کو کیوں رنگا ہے جن کی سادگی اور خلوص اب مجھ کو نظر نہیں آتا۔ آپ نے ایک رنگین نقاب ڈال کر مجھ سے بھی پردہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اس رنگ آمیزی سے خوش ہو کر گنگنانے لگتے ہیں کہ۔۔

ایک رنگین نقاب نے مارا
حُسن بن کر حجاب نے مارا

آپ نے میری محبت کو فریبِ نظر میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر یہ شک تھا کہ میری محبت میں کوئی کمی پیدا ہو رہی ہے۔ کیا آپ اس احساسِ کمتری میں مبتلا تھیں کہ آپ کا حُسن رُو بہ زوال ہے؟"

وہ اُلجھ کر بولیں — "توبہ ہے آپ سے بھی۔ اتنی سی بات کا یہ بتنگڑ بنا دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ذرا سی بات اتنا طول کھینچ جائے گی۔ جہیز میں جو میک اپ کا سامان آگیا تھا میں نے کہا لاؤ آج اسے استعمال کر لیں۔ ساری دنیا میک اپ کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"مجھے ساری دُنیا سے بحث نہیں۔ اپنی دنیا کا ذکر کر رہا تھا اور اپنی دُنیا میں اس تصنع کا میں قائل نہیں ہوں۔"

پر تولنے کے انداز سے چمک کر بولیں —— "مگر جناب آپ نے ہیڈ بیگم ریاض کے متعلق یہی کہا ہے کہ کیا مجال کبھی اُن کو کسی نے یوں ہی منہ جھاڑ سر پہاڑ دیکھا ہو۔ ہر وقت بنی سنوری رہتی ہیں۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا — "کاش آپ کو معلوم ہو سکتا کہ اس میں کتنا طنز تھا۔ بیگم ریاض اور ریاض کی بھلی چلائی۔ یہ میاں بیوی ہمیشہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولتے ہیں۔ میاں خضاب لگا کر جھوٹ بولتے ہیں بیوی پاؤڈر تھوپ کر غازہ چپڑ کر جھوٹ بولتی ہیں۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ آخر آپ کو اس تصنع کی کیا ضرورت

پیش آئی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں شمع کا پروانہ ہوں۔ اُس رنگین فانوس سے مجھے کوئی بحث نہیں جو شمع پر نظر آتا ہے"

غالباً اُنھوں نے رفعِ شر کے لیے کہا: "تو آخر اتنی بات بڑھانے کی کیا ضرورت تھی مجھ سے کہہ دیا ہوتا کہ میک اپ اُتار دو"

اور یہ کہہ کر وہ جانے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کچھ پژمردہ سی ہو گئی ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اپنے مستحکم حملے میں اس ناکامی کا اُن کو شدید احساس ہے۔ ایسی ہی اس احساس میں اُن کو مبتلا رکھ کر یقیناً سکون سے نہ رہ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اب نقشہ بدل دیا اور ارادہ کر لیا کہ اب ایسا نہ ہو اور یہ اختیار کیا جائے کہ یہ میک اپ بھی اُتر جائے اور چہرہ بھی نہ اُترے۔ لہٰذا میں نے اُن کو واپس بلایا۔

"میری بات سنیے۔ بیٹھ جائیے اور مجھ کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں یہ گھسیا بات زبان سے کہنا نہ چاہتا تھا کہ میں نے زندگی میں پہلی اور غالباً آخری محبت جس سے کی ہے وہ آپ کو خود معلوم ہے کہ آپ ہی تھیں۔ میں نے پرستش کرنے کے لیے آپ کا جو تصور اپنے دل میں قائم کیا ہے اُس کو کسی آرائش، کسی صورت گری اور کسی تصنع کی قطعاً ضرورت نہیں۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ کے حسن کو زینت نئے انداز سے خود میرا حسنِ نظر آراستہ کرتا رہتا ہے۔ رہ گیا یہ تمام سامانِ آرائش اس کی ضرورت تو اُن کو ہوتی ہے جو خود اپنے اوپر اعتماد نہ رکھتے ہوں نہ اُس پر جن کے لیے یہ تمام آرائش ہوتی ہیں۔ یہ ایک سمجھا بوجھا دھوکہ ہے اور مجھے اب تک یہی فخر تھا کہ ہم دونوں کے

درمیان اس دانستہ فریب کی نہ کبھی کوئی ضرورت پیش آئی اور نہ کبھی ہم اس سطح پر اترے کہ محبت کو زبردستی پھانسنے کیلئے اس قسم کے رنگین جال بچھائیں۔"

وہ بولیں — "ہاں ہاں اب میں بالکل سمجھ گئی ہوں"

میں نے کہا — "نہیں، آپ نہیں سمجھی ہیں۔ آپ نے اپنے کو خود اپنی ہی روغنی تصویر بنا کر میرے سامنے پیش کیا ہے۔ میں آرٹ کا قدردان ضرور ہوں۔ مگر آپ کے معاملے میں آپ کی رنگین تصویر مجھے قبول نہیں۔ مجھے میری سادہ اور معصوم زہرہ چاہیئے جس کو میں خود اپنے حسن نظر سے جس طرح چاہوں سجا لیا کروں۔"

وہ اب سچ مچ مسکرا کر جاتے ہوئے بولیں "میں ابھی آپ کی خدمت میں آپ کی زہرہ کو پیش کرتی ہوں۔"

اب مجھے پورا اطمینان ہو گیا کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ اب ان کو اپنی اس آرائش پر نہیں بلکہ خود اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا تھا جو ان کی آنکھوں سے نظر آ رہا تھا اور مجھ کو اس ایک اپ کی زیرباری سے ہمیشہ کے لیئے نجات مل چکی تھی۔ دراصل یہ مخدرات اس آرائش اور صورت گری سے مسلح ہو کر ہم غریب اور بے چارہ قسم کے شوہروں کے متعلق یہ چاہتی ہیں کہ —

"گربہ کشتن روزِ اول"

مگر ذرا سی سمجھداری سے اگر کام لیا جائے اور خدا شوہروں کو بھی عقل دے تو وہ

گربہ کشتن روزِ اول

کے اصول پر چل کر زندگی بھر کے اس عذاب سے نجات حاصل کر سکتے ہیں کہ ایک ایک دوکان میں جھانکتے پھر رہے ہیں کہ کیوں صاحب اس نمبر اور اس شیڈ کا پاؤڈر ہے؟ اس رنگ اور اس کمپنی کا روج ہے؟ کیوں صاحب یہ سینٹ کہاں مل سکتا ہے؟ اور کیوں صاحب سُنا ہے کہ آپ کی دوکان سے بیگم رضوی ایک ماتھے کی بندیا لے گئی ہیں وہ عنایت کر دیجئے۔ پھر اس احمقانہ دوڑ دھوپ کے علاوہ بجٹ ہمیشہ خسارے کا رہے گا اس میں شک نہیں اس طرح رنگ روپ کا تھوڑا سا خسارہ ضرور ہے مگر زندگی بھر کی عافیت ان داموں میسر آ جائے تو سودا مہنگا نہیں ہے۔

"ب"

اب میں کیا کہوں ان پنڈت جی کو جنھوں نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ "ب" کا حرف تمہارے لئے نہایت نحس ہے تمہاری موت کا خواہ کوئی بھی سبب ہو۔ مگر وہ سبب ہوگا "ب" سے لہٰذا ہر اس چیز سے بچو جس کا نام "ب" سے شروع ہوتا ہے بظاہر تو یہ ایک حرف تھا مگر جب احتیاط شروع کی تو پتہ چلا کہ یہ "ب" اس قدر عالمگیر ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ بجلی خواہ وہ بادلوں میں چمکے یا گھریلو روشنی کی صورت میں ہو خوفناک بن گئی۔ بندوق بارود۔ بندر۔ بن مانس۔ بچھو۔ وغیرہ تو خیر ہیں ہی بیہودہ چیزیں۔ مگر بہن، بھائی اور بیوی تک سے جو شخص بچ نہ رہ سکے، بھتیجوں اور بھانجوں سے جس کو ہر وقت اندیشہ ہو۔ برفی ایسی مٹھائی نہ کھا سکے۔ گرمیوں میں برف سے پرہیز کرے بھوپال اور بمبئی کے نام سے گھبرائے اور کراچی پہنچ کر جس کو یہ خیال ستائے کہ یہ بھی تو بندرگاہ ہے بائیسکل دیکھ کر جس کا خون خشک ہو جاتا ہو اور سوتے سوتے جو شخص بستر الٹ کر

کرسی چارپائی پر بیٹھنے کو ترجیح دے بدرالحسن ایسے دوست اور بخاری ایسے کرم فرما سے الجھن ہو۔ بچوں کو دیکھ کر جسے وحشت ہونے لگے اور پائپ کو جسے ترک کر دینا پڑے اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ دل کو جیسے یقین سا تھا کہ تاریخ وفات کسی سال میں بھی ہو مگر یہ طے ہے کہ دسمبر کی بارہ۔ یا بیس یا بائیس ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ دسمبر سال کا بارہواں مہینہ ضرور ہوتا ہے اور ہر مہینے میں یہ تین تاریخیں ایسی ہوتی ہیں جو "ب" سے ہوں۔ سنہ باون کے شروع ہوتے ہی صدقہ خیرات شروع ہوا اور یہ احتیاط رکھی گئی کہ صدقہ کے لئے بکرا نہ آئے۔ مینڈھا آئے تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ دُنبہ آجائے۔ اگر یہ صدقے قبول ہوگئے اور سنہ باون کا بارہواں مہینہ اور اس کی بارہ۔ بیس اور بائیس تین تاریخیں خیریت سے گذر گئیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ سنہ باسٹھ تک کی تو گویا مہلت مل ہی جائے گی۔ مگر مہلت کیا خاک مل جائے گی۔ ہجری سنہ کے بارہویں مہینے میں بھی یہ تین تاریخیں تو پڑتی ہی ہیں اور بکرمی سنہ کی تو ہر تاریخ خطرناک ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اس "ب" سے بچ کر کہاں جائے۔ اب آپ کو یقین نہ آئے گا۔ ہر سال عید تو خیر عید ہوتی ہے۔ مزے سے گزر جاتی ہے مگر بقر عید قیامت بن کر آتی ہے۔ خدا خدا کر کے جب یہ تہوار گزرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اس "ب" سے بعض اوقات ایسی مڈبھیڑ ہوتی ہے کہ اب کیا عرض کیا جائے۔ مثلاً حال ہی میں جو واقعہ ہوا ہے وہ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ یہ تو میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ سن باون مجھ پر بھاری ہے۔ دسمبر یعنی اس سال کا بارہواں مہینہ تو خیر ابھی دور ہے مگر میں ہر مہینے بارہ۔ بیس

اور بائیس تاریخ کو روزہ رکھ لیتا ہوں احتیاطاً اور ذرا انداز بھی علی الحساب ٹھیک لگاتا ہوں۔ اس کے علاوہ ہر دن اور ہر رات کے بارہ بجے ذرا ہوشیار سا ہو جایا کرتا ہوں۔ گذشتہ اپریل میں یوم اقبال اطرافِ ملک میں منایا گیا۔ خیریت یہ ہے کہ یوم اقبال اکیس تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ یعنی دو خطرناک تاریخوں کے بیچوں بیچ۔ بہر حال مجھ کو اکیس تاریخ پر ذاتی طور پر خاص اعتراض نہیں ہے۔ مگر چونکہ تمام اطراف ملک کے لئے ایک ہی تاریخ ناکافی ہے لہذا تصادم کے خوف سے لوگ مختلف تاریخوں میں بھی یوم اقبال منایا کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ نوجوان دعوتی رقعے لے کر میرے پاس آئے معلوم ہوا کہ بزم ادب بادامی باغ کے کارکن ہیں جس کے زیر اہتمام بیس اپریل کو یوم اقبال کے سلسلے کا مشاعرہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی شرکت کروں۔ دعوت نامہ دیکھ کر خون ہی تو خشک ہو گیا "ب" کی بھرمار بھی، بزم ادب میں "ب" بادامی میں "ب" باغ "ب" پھر بیس تاریخ۔ دل نے کہا کہ برخوردار یہ موت کا پروانہ ہے۔ گئے نہیں کہ قصہ پاک ہوا سینکڑوں بہانے کر کے ان کو ٹال دیا۔ بائیس اپریل کو بھی ایک مشاعرہ تھا اس سے بھی نجات حاصل کی مگر چوبیس تاریخ کو ایک تقریب محفوظ نظر آئی۔ چنانچہ شرکت کا وعدہ کر لیا۔ شہر کے باہر جانا تھا کہ تاریخ چونکہ محفوظ قسم کی تھی لہذا روانگی کے انتظامات مکمل کر لئے۔ ایک معمولی سی احتیاط یہ ضروری کی کہ جو صاحب مدعو کرنے آئے تھے جب وہ لینے کو آئے تو ان سے عرض کر دیا کہ صاحب میں اصولاً بس میں سفر نہیں کرتا یا تو موٹر کا انتظام کیجیے یا ریل سے چلیں گے۔ وہ ریل کے

چلنے پر راضی ہو گئے۔ مگر اب یہ اتفاق ملاحظہ ہو کہ ریل کا وقت بارہ بج کر بیس منٹ تھا ظاہر ہے یہ ریل بھی ایک قسم کی بس ہی ہوتی۔ موٹر کی لائن کے بجٹ میں گنجائش نہ تھی اور نہ یہ بات ان کو آسانی سے سمجھائی جا سکتی تھی کہ بارہ بج کر بیس منٹ پر روانہ ہونے والی ٹرین سیدھی عدم آباد جاتی ہے سوال یہ تھا کہ اب آخر کریں تو کیا کریں، ارادہ کیا کہ اختلاج قلب کا ایک شدید دورہ فوراً تصنیف کیا جائے تاکہ یہ صاحب خود ہی ٹل جائیں۔ مگر دورہ شروع ہی ہوا تھا کہ وہ صاحب حکیم بن گئے ایک نعرہ بلند کیا "ارے بھائی گرمی ہے۔ فوراً بید مشک اور برف کا انتظام کیا جائے، لیجئے یک نہ شد دو شد بید مشک اور برف۔ زہر اور وہ بھی دو آتشہ نسخے کے دونوں اجزا ہیں سب" فوراً اس دورے کو ملتوی کرنا پڑا اور ان سے عرض کیا کہ میں ٹھیک ہو گیا ہوں مگر اس حالت میں فوراً سفر پر روانہ ہونا مناسب نہیں ہے وہ بھی آدمی معقول نکلے۔ ٹائم ٹیبل دیکھ کر بولے "مناسب ہے دوسری گاڑی دو بجکر پندرہ منٹ پر جاتی ہے" ظاہر ہے کہ اس ٹرین سے سفر کرنے میں کوئی اندیشہ نہ تھا لہٰذا اس ٹرین سے روانہ ہو گئے اور جب گاڑی چل دی تو وہ ٹریجڈی شروع ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ، اب تک تو کچھ رسمی تکلفات کی وجہ سے کچھ اختلاج کے دورے کی وجہ سے ان حضرت سے تفصیلی گفتگو ہی نہ ہوئی تھی۔ اب جو ٹرین میں اطمینان سے بیٹھے تو ان حضرت سے کہا:۔

"بھئی معاف کیجئے گا میں نے اب تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ جناب کا اسمِ مبارک کیا ہے؟"

وہ بتیسیں نکال کر بولے "بندے کو بشیر بیگ کہتے ہیں"

ایک دم جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ بشیر بمعہ بستر بیگ۔ سفر میں ایک چھچھوندر بھی ساتھ ہیں۔ یہاں یہ احتیاط کہ بیگ یا بکس یا بستر تک ساتھ نہیں لیا تھا کیا معلوم تھا کہ بستر اور بیگ کے بجائے بشیر بیگ مل جائیں گے گھبرا کر پوچھا۔ اور تخلص کیا فرماتے ہیں جناب خیال آیا کہ تخلص ہی کے سہارے یہ سفر طے کر لیں گے۔ ان حضرت نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔ "بسمل کہتے ہیں اس خاکسار کو"

جی چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچ لیں۔ یعنی بدتمیزی ملاحظہ ہو کہ تخلص تک آپ کو "ب" کے علاوہ کوئی نہ ملا۔ بیوقوف کہیں کا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ضرور سفر آخرت ہے اور یہ شخص جس کے ایک ہی نام میں تین "ب" موجود ہیں یقیناً ملک الموت ہے میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بقر عید کے دن ہر مہینے کی بارہ، بیس اور بائیس تاریخوں کو یا ہر روز کے بارہ بجے اور ہر رات کے بارہ بجے طاری ہوا کرتی ہے۔ ان حضرت کو میرے محسوسات کی کیا خبر آپ نے میری دلچسپی کے لیے اپنے بیگ سے تاش نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور نہایت بے تکلفی سے بولے "رمی جانتے ہیں آپ" اب میں ان سے کیا کہتا کہ تاش کا شوق پنڈت جی نے جس دن سے ہاتھ دیکھا ہے ایسا چھوٹا ہے کہ جیسے کبھی تاش کھیلے ہی نہ تھے اب یہ باون پتوں والا خوفناک کھیل کون کھیلے۔ میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے ان کو دوسری باتوں میں لگانا چاہا۔ آپ

غالباً اس طرف کے بسنے والے تو نہیں ہیں "

وہ ماتھے کے پسینے پونچھتے ہوئے بولے "جی نہیں میں تو پاکستان بننے کے بعد حاضر ہوا ہوں ورنہ غریب خانہ تو بانس بریلی ہے "

انا للہ وانا الیہ راجعون غریب خانہ بھی اس بے ہودہ نے چھانٹ کر وہاں کا رکھا ہے جہاں ایک چھوڑ دو "ب" ہوں۔ یہ شخص ضرور آج کوئی حادثہ کرائے گا۔ ارادہ کیا کہ اب کافر ہو جو اس سے بات بھی کرے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ حضرت خود ہی بولے۔

"ویسے زیادہ تر رہنے کا اتفاق ہوا ہے بسوان "

گھبرا کر عرض کیا "یہاں جناب کا کیا شغل ہے ؟"

نہایت مسکین صورت بنا کر کہا "بیکاری "

دیکھئے کتنا ٹھوس سوال تھا مگر کس قدر شورش انگیز جواب دیا ہے اس نامراد نے مشاغل میں بہت کم ایسے ہوں گے جو "ب" سے شروع ہوتے ہوں تاوقتیکہ آدمی بدمعاش، بندوقچی، بھروپیہ، بساطی، بکر قصاب، برق انداز وغیرہ نہ ہو یا پھر بیرسٹر ہو "ب" والا پیشہ ڈھونڈھ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اب تو یہ بھی پوچھنا خطرے سے خالی نہ تھا کہ ہجرت سے پہلے جناب کیا شوق فرماتے تھے۔ فرض کیجئے وہ کہہ دیں کہ۔ "بینڈ ماسٹر تھا میں" تو میں ان کا کیا کر لوں گا۔ میں نے دراصل ان سے ڈر کر اپنی توجہ باہر کے مناظر کی طرف مبذول کر دی اور کھڑکی سے باہر منہ نکال کر ان حضرت سے اپنے نزدیک چھٹکارا ہو گیا۔ اب وہ

لاکھ کچھ کہیں۔ میں ہوں۔ ہوں نا۔ نہیں ہیں مختصر جواب دیتا اور ان کو ٹالتا رہا۔ آخر وہ نہایت بے تکلفی سے میری ہی سیٹ پر آ کر بولے ؎

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک

ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

بدمعاشی دیکھی آپ نے غالب کا شعر بھی وہ چھانٹا ہے جو "ب" سے شروع ہوتا ہے جیسے اس شخص نے میری چڑھ مقرر کر لی ہو۔ میں نے ان حضرت سے کہا، بات یہ ہے کہ میں کچھ شعر کہنا چاہتا ہوں آپ کے مشاعرے کی طرح ہیں۔"

کہنے لگے "صاحب طرح تو بہت شگفتہ ہے۔ ع میں نے دامن جسے سمجھا تھا گریباں نکلا۔ مگر اس زمین کو تو غالب ختم کر گیا یہ شعر کہہ کر کہ ؎

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

پھر "ب" والا شعر، شعر اچھا ہے تو ہوا کرے۔ کس کام کا وہ شعر جو "ب" سے شروع ہوا ہو۔ اس شعر کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح سے طبیعت اُچاٹ ہو کر رہ گئی اور میں نے گھبرا کر کہا "دوسری طرح بھی تو ہے"

وہ کہنے لگے "جی ہاں وہ سرا مصرعہ ہے (۲) ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔"

اور میرا دل دھک سے رہ گیا کہ اب یہ غالب کا شعر پڑھتے ہیں کہ ؎

بس ہجومِ نااُمیدی خاک میں مل جائے گی۔ یہ جو اِک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے۔

مگر شکر ہے کہ ان کو یہ شعر پڑھنے کا موقع نہ ملا اور ایک اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی ہوئی تھی کہ وہ حضرت بولے "یہاں کی بالائی بہت مشہور ہے دیکھئے ابھی کھلاتا ہوں۔ حالانکہ اس نامعقول کو واقعی کھلانا ہوتی تو "ملائی" کہتا "بالائی" نہ کہتا میں اس کو یہ تو سمجھ سکا کہ ہمیشہ "بالائی" کو "ملائی" سمجھ کر کھایا ہے مگر وہ ملائی کو بالائی کہہ کر جس کے لیے خطرناک بنا رہا تھا۔ بہرحال میں نے عذر کر دیا کہ میں یہ چیز نہیں کھاتا۔ اور وہ خود نہایت بدتمیزی کے ساتھ سچ مچ کی "ملائی" کھا رہا تھا اور محض مجھ سے بچانے کے لیے اس کو "بالائی" کہتا جا رہا تھا۔ مگر جب اس نے دام دیتے ہوئے بارہ آنے گن کر دیئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بالائی نہ سہی ملائی سہی مگر تھی تو بارہ آنے کی یہ تو بالائی تھی جس شخص نے باپ کو ہمیشہ والد سمجھا ہو۔ بیٹے اور بیٹی کو ہمیشہ لڑکا اور لڑکی سمجھتا ہو وہ ذرا سی بالائی پر اپنے اس دیرینہ اعتبار کو کیونکہ قربان کر دیتا۔ بہرحال خدا خدا کر کے اس اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی ہی تھی کہ یہ حضرت ایک انگلی اٹھا کر چیخے "وہ دیکھیے بارہ سنگھا" کاش ان کو معلوم ہوتا کہ وہ خود بھی مجھے بارہ سنگھے ہی نظر آ رہے تھے۔ خیر یہاں تک تو سب کچھ برداشت کیا مگر ہوش تو اس وقت اڑ سے گئے جب ان حضرت نے برسبیل تذکرہ فرمایا "اس شاعر کے لیے بارہ دری سے بہتر مقام مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔ اور بارگاہ بھی ایسی سجائی ہے کہ باید و شاید۔ لیکن تو بارہ دری میں شاعرہ دوسرے اس میں بارگاہ سجائی گئی ہے اور وہ بھی ایسی کہ باید و شاید نہیں۔ صاحب یہ مشاعرہ تو زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ جہنم میں گیا مشاعرہ اور جہنم میں گئے اس شاعری کے

شوق پر جان ہے تو جہاں ہے شکر ہے کہ راہ فرار بھی مل گئی۔ اگلے ہی اسٹیشن پر لاہور
آنے والی گاڑی سے میل ہوتا تھا کہ میں ٹہلنے کو نکلا اور یک بیک نکل گیا اس گاڑی تک
آگیا جو لاہور کے لیے رینگ رہی تھی اور جست کر کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا
کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھا کہ بارہ سنگھا اس ٹرین کی طرف دوڑ رہا تھا۔ چند کہیں کا

مسور کی دال

میری جان سے قدر میرے ایک پڑوسی تھے۔ ان کا پڑوسی ہونا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ وہ میری پڑوسن کے شوہر تھے۔ میں آپ سے کیا عرض کروں کہ ان میاں بیوی کے اجتماع ضدین کا کیا ناگوار اثر میرے دماغ پر پڑ چکا ہے اور وہ دماغی الجھن کچھ اور بھی شدید ہو جاتی ہے جسے سلجھانے میں آدمی کو خواہ مخواہ محتاط ہونا پڑے۔ احتیاط کا سوال اس قصے میں یوں پیدا ہوا کہ میری پڑوسن بیگم صاحبہ کی پہلے تو ہمسائی بنیں۔ پھر بہن بنیں اور آخر میں ہمسائی تو نہیں البتہ بہن کچھ ضرورت سے زیادہ بن گئیں، آپ کہیں گے یہ تو کوئی احتیاط کی بات نہ ہوئی مگر میں تو فی الحال تمام حدود اربعہ بیان کر رہا ہوں۔ اور اگر اس حدود اربعہ سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے تو لیجیے میں صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ وہ نہایت حسین و جمیل بھی تھیں۔ غالباً اس ایک بات کے بعد ہر وہ شخص جو شوہر ہے یا کبھی رہ چکا ہے۔ میری احتیاط کی وجہ سمجھ گیا ہوگا۔

مگر میں چاہتا ہوں کہ اُس مخلوق کو بھی فائدہ پہنچے جو اب تک شوہر نہیں بنی ہے۔ اور یہ اس سے روز بروز قریب آ رہا ہے بات یہ ہے کہ یہ جو شادی سے پہلے کی مختصر سی زندگی ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو عقل سے کام لینے کا یہی زمانہ ہے اس کے بعد تو ایک ایسے پاسبانِ عقل کے ہاتھوں میں عقل کی باگیں پہنچ جاتی ہیں جس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ خود بھی عقل سے تعلق رکھتا ہو۔ بلکہ عموماً کامیاب پاسبانِ عقل وہی ثابت ہوتا ہے جو خود عقل سے غیر متعلق ہو۔ خیر یہ تو بجائے خود ایک تفصیلی بحث ہے جس کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ باوجود شادی ہو جانے کے عقل کی التباس اتنی مجھ میں باقی تھی۔ کہ میں نے اپنی بیوی سے ان پڑوسن صاحبہ کے متعلق کبھی براہِ راست کوئی سوال نہیں کیا ورنہ سوال بھی میں ہی کرتا اور جواب بھی مجھ ہی کو کرنا پڑتا کہ جناب کو آخر یہ کھوج کیوں ہے۔ آپ آخر پڑوسن کی فکر میں کیوں دُبلے ہو رہے ہیں۔ اور اسی قسم کی جرح ہی کے بعد میں نے بہت سے بے گناہ شوہروں کو حبسِ دوام کی سزا پاتے ہوئے دیکھا۔ لہٰذا کوئی اس کو میری بزدلی یا عقلمندی ہی میں تو ان پڑوسن صاحبہ کے اتنا ہی غیر متعلق بنا رہتا تھا جتنا در اصل ان کے اور ان کی زندگی کے متعلق غور کرتا رہتا تھا۔

غور کرنے کی بات ہی تھی نہایت مہذب پڑھی لکھی صورت شکل تو میں عرض ہی کر چکا ہوں۔ مگر حسن کو زیادہ سے زیادہ دِل آویز بنانے کے لیے جو ایک خاص سلیقہ ہوتا ہے اس سے بھی بھرپور۔ نہایت چہل پہل کی اور زندہ قسم کی

شوہر ڈھونڈا ہے کہ خدا دشمن کی بیٹی کو بھی ایسا شوہر نہ دے۔ کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ مختصر یہ کہ موصوف کو ایک اونٹ فرض کر لیجئے۔ اور اس اونٹ سے پوچھئے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ اس کے جواب میں وہ جس زاویے سے تشریف فرما ہوں گے، اسی سے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔ صاحب وہ نامعقول پڑوسی تو اس قابل بھی نہ تھا کہ یہ معقول پڑوسن اس کے سلام کا بھی جواب دیتی۔ مگر خدا کی شان کہ وہ شوہر تھے اور یہ بیوی۔ اور جب دونوں ایک دوسرے کے قریب نظر آتے تو میرے دماغ میں عجیب عجیب فقرے آیا کرتے تھے۔ مثلاً بدصورت خوش نصیب، خوب صورت، بدنصیب یہ سنجوگ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس غریب لڑکی کو اپنے کن اعمال کی سزا میں یہ عذاب کا فرشتہ ملا ہے، بہت سے امکانات دماغ میں آتے، مگر ایک ایک کر کے ہر طرف سے اطمینان کر لیا۔ مثلاً ممکن ہے۔ دولت کی چمک دیکھ کر والدین نے یہ دختر فروشی کی ہو مگر معلوم ہوا کہ دولت کے معاملے میں بھی وہ کچھ اپنی ہی قسم کے شریف زادے واقع ہوئے تھے پھر خیال آیا کہ قرابت کے فرسودہ بندھن ایسے ہوتے ہیں کہ گھر کی لڑکی گھر ہی میں رہے، خواہ وہ شوہر منجملہ مویشی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر پتہ چلا کہ عزیز داری بھی نہیں ہے۔ صاحب بجلی تو اس دن گری ہے جب بیگم صاحبہ نے خود بخود یہ ذکر چھیڑ کر بتایا کہ صاحبزادی نے یہ "گل رو" خود اپنے لیے منتخب کیا ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا تو میں نے اس لڑکی سے اپنی ہمہ

ہمدردی کی خود ہنسی اڑائی۔ ظاہر ہے کہ اب اندر زیادہ سے زیادہ یہ ہمدردی ہو سکتی تھی کہ افسوس بیچاری پاگل ہے۔ جتنی جتنی وہ باہوش ہوتی جاتی تھی اسی قدر اس کے پاگل پن پر ایمان آرہا تھا۔ رہ گئے اس کے وہ قابلِ دید شوہر ان کو دیکھ کر اب صرف ایک ہی فقرہ دماغ میں گونجا کرتا تھا کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ مگر غور تو کیجئے منہ بیچارے کا کیا قصور جب خود مسور کی دال اڑ کر اس میں پہنچ جائے۔

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے ذہن میں کبھی ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اس مسور کی دال کے لیے منہ خود مجھ کو ہونا چاہیے تھا۔ مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے دیکھئے نا جھوٹ تو صرف بیویوں سے بولا جاتا ہے فرض کیجئے میں آپ کی نظروں میں بہت ہی نیک نیت اور خوش اطوار ثابت ہو گیا تو بھی آپ مجھ کو کون سا انعام دے دیں گے یا میری عاقبت پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ اس قصے میں رقابت کی قسم کا کوئی سوال ہی نہ تھا البتہ خواہ مخواہ کی ضد سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس جمہ گیر بیہودہ پڑوسی سے جو خزانے پر بیٹھا ہوا سانپ معلوم ہوتا تھا خود بخود ایک جوش سا پیدا ہوتا تھا کہ ایک گلاس ٹھنڈے کا پانی اس کو پلا کر علی الحساب پچاس جوتے اس کو مار دیئے جائیں اور پھر اس سے پوچھا جائے کہ تو نے یہ گستاخی کیسے کی اور اگر خدا توفیق دیتا تو اس پگلی پڑوسن سے بھی پوچھتا کہ محترمہ گستاخی معاف آپ نے آخر یہ ایشیمی قسم کا شوہر کس سلسلے میں پالا ہے ؟ مگر یہ ہو سکا نہ وہ البتہ ایک آدھ مرتبہ

بیگم صاحبہ سے عزیزہ یہ کہا کہ کبھی خدا کا شکر بھی ادا کرتی ہو کہ تمہارے شوہر کو اس نے ۶۰۰ سے بڑا تو..... ایک سے بہتر بنا دیا اور اس کے جواب میں وہ ہمیشہ عبرت کے طور پر اپنے کان پکڑ کر گالوں پہ ہاتھ مار لیا کرتی تھیں کہ "خدا بچائے یہ تو توبہ کا مقام ہے" اور بس اسی سے غریب کو تھوڑا بہت احساس برتری پیدا ہو چلا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ چہل پہل اور رونق ڈھلی پڑ گئی۔ حسن کچھ ویران سی نظر آنے لگی۔ تبسم جو اس کی بے ساختگی کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ اس کے لبوں کی ساخت میں شامل تھا۔ ان ہی لبوں پہ مرجھا کر رہ گیا۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی اور ایک سناٹا سا اس پر برسنے لگا جیسے کسی کی نظر لگ گئی ہو۔ ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ بیگم صاحبہ سے ان کی ان منہ بولی بہو کی خیریت دریافت کریں۔ اگرچہ بڑی احتیاط اور اس قدر شدید گریز کہ اب تو خود اپنے دل میں چھپے ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ اور شبہ کو دور کرنے کے لیے آخر ایک دن ہمت کر کے بیگم سے پوچھ ہی لیا۔ "یہ تمہاری نجمہ آج کل بہت چپ چپ سی رہتی ہے۔"

بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر فیصلہ سنا دیا۔ "وہ اسی طرح مر جائے گی"

اور میرا بیٹا نکما پن والا ٹھکانہ ہو گیا۔ میں نے ایک مصرعہ پڑھ دیا۔ "ابھی تو نہ تھے اس کے مرنے کے دن"

خدا کا شکر ہے کہ بیگم اس مصرعہ کو نہ سمجھیں۔ ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ

—— بیوی اپنے شوہر کے متعلق یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ کسی نامحرم عورت کے متعلق کوئی شعر یا کوئی مصرعہ پڑھے۔ بیگم صاحب نے فرمایا۔ کمبخت ناخدا را۔ مرد کی ذات ہی بیوفا ہوتی ہے"

میں نے حیرت سے پوچھا "یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ نجمہ کے شوہر نے اس سے بیوفائی کی ہے میں کیسے یقین کروں"۔

بیگم صاحبہ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "یقین کرنے کی کیا بات، مرد کا کوئی اعتبار نہیں"

عرض کیا "یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر انسانوں کے تذکرے میں اس جانور کو تو شامل نہ کیجئے میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ کیا وہ بے وفائی بھی کر سکتا ہے۔ یعنی اس کو بیوفائی کرنا بھی آتا ہے"۔

بیگم نے کہا "جی ہاں، آئینے میں اپنا منہ نہیں دیکھا اور چلا ہے بیوفائی کرنے"

عین اسی وقت پڑوسن کی کھڑکی کھلی اور پڑوسن جو ہمیشہ بہار کی طرح آیا کرتی تھیں اپنے کو خزاں بناتے ہوئے نظر آئیں۔ بیگم نے ان کو دیکھتے ہی کہا "بڑی عمر تمہاری تمہارے بھائی صاحب تمہارے ہی متعلق مجھ سے پوچھ رہے تھے"۔

جی ہاں۔ بھائی صاحب یہ جو عاقبت اندیش بیویاں ہوتی ہیں۔ یہ باقی تمام خوبصورت عورتوں سے اپنے شوہر کو زبردستی بھائی کہلوا دیا کرتی ہیں۔ اور سعادت مند شوہر اپنی بیوی کی سہیلیوں کو بہن ہی کہتے ہیں حسین عورتوں سے اپنے کو بھائی

کہلواتا جس قدر ناقابلِ برداشت بدمذاقی ہے اسی قدر عام ہے یہی تو خیر کس شمار و قطار میں بھول مولانا حالی تک نے اس کی شکایت کی ہے کہ ۔ ۔ دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت۔

پڑوسن مجھ کو دیکھ کر کچھ سمٹی سمٹائی بیگم کے پاس بیٹھ گئیں اور زبردستی اپنے مردہ تبسم کو زندہ کرنے کی کوشش میں کچھ طنز سے ملتی جلتی چیز بنا کر بولیں "بھائی صاحب یہ سب مقدر کے کھیل ہیں"

میں نے براہِ راست پوچھا "مجھے تو حیرت ہو رہی ہے یہ باتیں سن کر آخر قصہ کیا ہے"

بیگم صاحبہ نے ایک تفصیلی بیان دیتے ہوئے بتایا کہ اُس بیہودہ پڑوسی کو کسی اور خاتون سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور اب وہ ایسا قابو سے باہر ہوا ہے کہ اُس کو نہ گھر کی فکر ہے اور نہ بیوی کی پرواہ اپنی نئی محبوبہ کی گلی کے سو سو پھیرے ہیں اور وہ ہے۔

میں نے گھبرا کر کہا "صاحب سوال تو یہ ہے کہ یہ حضرت تو خیر بدحواس ہو سکتے ہیں۔ مگر ان کی بدحواسی سے ہوتا کیا ہے۔ جب تک وہ خاتون ان کو منہ نہ لگائیں"

پڑوسن نے کہا "بھائی صاحب قصہ تو یہی ہے کہ ع
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

"عورت تو خود ہی ہزار جان سے فریفتہ ہے"

میں نے واقعی چونک کر کہا: "فریفتہ ہے یعنی ان پر —— اپنے شوہر پر تو آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

پروین نے نہایت متانت سے مسکرانے کی بڑی پژمردہ کوشش کرتے ہوئے کہا: آپ ہی کو نہیں ہر ایک کو تعجب ہوگا یہ سن کر اور سب سے زیادہ خود مجھ کو تعجب ہے مگر میرے تعجب سے ایک جیتی جاگتی حقیقت پر پردہ تو نہیں پڑ سکتا۔

یہ ادبی زبان وہ بدنصیب عام طور پر بولا کرتی تھی اور میرا عقیدہ ہے کہ اس قسم کی ادبی زبان عام طور پر وہ عورتیں بولتی ہیں جن کی عملی زندگی اسی ماحول کو ترستی ہے جو یہ زبان پیدا کرتی ہے اس قسم کی زبان سے جو تصنع برستا ہے یہی تصنع ان کی پوری نہ ہو سکنے والی تمنا ہوتا ہے اور وہ بیچاریاں تمنا سہی فریب تمنا کو اپنے لیے بہت کچھ سمجھتی ہیں۔ مجھے اس وقت واقعی اس بیچاری پر ترس آرہا تھا۔ مگر مجھے اسوقت اپنے ایک ذہنی دشمن کے خلاف زہر اگلنے کا موقع بھی تو مل چکا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کہا: "معاف کیجیے گا آپ کو اس نے واقعی بڑی حیرت ہے مگر مجھے تو اسی پر حیرت ہے کہ خود آپ نے کیونکر ع

چھانا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی"

پروین نے کہا: جی ہاں ظفر انتخاب کی لیلی یوں پھڑکی تھی کہ اپنی بڑی بہن کی جہنمی زندگی میرے پیش نظر تھی۔ میری بڑی بہن کے شوہر نہایت حسین و جمیل آدمی

ہیں اور ان کا حسن و جمال میری بہن کے حق میں اتنا بڑا عذاب تھا کہ وہ زندگی بھر اس عذاب سے نجات نہ پا سکیں اور یہی غم لیے ہوئے رخصت ہو گئیں۔ میرے بہنوئی جتنے خوبصورت ہیں اتنے ہی بد نظرے اور نہ جانے یہ کیا بات ہے کہ ان بد نظروں کو مرکز نظر بھی خوب خوب مل جاتے ہیں میرے ان بہنوئی صاحب پر جس کو دیکھئے وہی فریفتہ ہو رہی ہے میری بہن بیچاری کہا کرتی تھیں کہ کاش یہ کانے ہوتے کاش یہ لنگڑے ہوتے۔ کاش یہ لپ لپے ہوتے مگر ہوتے صرف میرے لیے اور میں اسی وقت سے یہ سوچا کرتی تھی کہ عورت کے لیے یہ شرکت کا غم کتنا بڑا الم ہے۔

بیگم صاحبہ نے بات کاٹ کر کہا "مثل مشہور ہے کہ خدا اندھی کی مرت بھی نہ دے"

میں نے ان کو خاموش کرنے کے لیے کہا "جی۔ جی آپ فرماتے ہیں میں گہرا مطالعہ کر رہا ہوں آپ کی زندگی کا۔"

پڑوسن نے کہا "تو بھائی صاحب میں نے اپنا ہر طرح جائزہ لیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ ممکن ہے کہ کوئی عورت اس کو برداشت کر جائے مگر میں تو ایک منٹ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ میرا شوہر کسی اور کو پسند کرے یا کوئی اور میرے شوہر کو پسند کرے اور یہ خیال ذہن میں کچھ اس طرح جڑ پکڑ گیا کہ مجھے شادی کے خیال ہی سے الجھن ہونے لگی۔ میری نسبتیں بہت سی آئیں مگر میں نے اپنی بہن سے صاف کہہ دیا کہ لڑکا جتنا معقول ہوگا۔ اسی قدر مجھ کو خطرناک نظر آئے گا۔ یہاں تک

کہ میری بہن کو یقین ہو گیا کہ شاید میری شادی ممکن ہی نہیں ہے۔ مگر ایک دن میں
اپنی بہن کو ان کے بستر مرگ پر چونکا دیا کہ میں نے اپنے لیے لڑکا پسند کر لیا ہے
اور وہ بھی حضرت تھے۔ یہ بیچارے میرے بہنوئی کے پاس معلوم نہیں کس کام سے
آئے تھے مگر بہنوئی صاحب نے ان کو ایسا پھبتی زیب پایا کہ تفنن طبع کے لیے
اپنے پاس رکھ لیا۔ بس ان کا کام صرف یہ تھا کہ میرے بہنوئی اور ان کے احباب ان
پر اپنی ذہانتیں صرف کرتے تھے، اور جب وہ سب ہنستے تھے تو یہ بھی احمقانہ
ہنسی ہنس دیا کرتے تھے، معلوم نہیں کیوں مجھے ان کی حالت پر ترس آنے لگا
اور یکایک میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ ہو سکتی ہے۔ وہ شخصیت
جسے کوئی اور اپنانا نہ چاہے، اور یہ ہو سکتا ہے، وہ محفوظ قسم کا شوہر جو میرے
بہنوئی کی طرح بیوی کو موت کے گھاٹ نہ اتار دے۔ میری اس تجویز پر میری
بہن سناٹے میں آگئیں، مذاق سمجھ ہی نہ سکتی تھیں، اس لیے کہ وہ بیچاری لب گور
تھیں مردے سے کون مذاق کرتا ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپا اگر آپ
اپنی موت مجھ کو دینا نہیں چاہتیں، تو میری ان ہی سے شادی کر دیجیے۔

بیگم صاحب نے پھر ٹوکا، پاگل جو ٹھہریں۔

میں نے بیزاری سے کہا "بات تو سنیے جی بہن!"

پڑوسن نے بیزاری سے کہا، جی ہاں تو تحقیقات کی گئی ان کے متعلق
خاندان اچھا تھا، تعلیم بھی تھی، اور کچھ بھی ہوتا تو میری ضد ہی کافی تھی، دنیا کو حیرت

میں مبتلا چھوڑ کر میں ان کی بیوی بن گئی اور اب مجھ کو حیرت میں مبتلا چھوڑ کر یہ بھی دوستوں کے بن گئے ہیں۔

میں بڑی دیر تک سناٹے میں رہا، مگر مجھے حیرت سے زیادہ تجسس ہے۔ میں اس دوسری پاگل عورت کو دیکھنا چاہتا ہوں جس کا دماغ بھی خراب ہے اور نگاہ بھی، بلکہ سچ پوچھئے تو اب مجھے خود اپنے دماغ اور اپنی نگاہ پر اعتبار نہیں رہا ہے۔

کرکٹ سے شاعری تک

کرکٹ کے مشہور کھلاڑی امتیاز احمد کا کلام "میرے شعر" اس وقت پیش نظر ہے،
اس پر تو خیر بعد میں غور کیا جاتے گا مگر اس کتاب کو دیکھ کر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے
کہ اگر کرکٹ کے آئین مشاعروں میں نافذ ہو جائیں اور آداب مشاعرہ کا رواج
کرکٹ سے میدان میں شروع ہو جائے تو عجیب و غریب انقلاب سے دوچار
ہونا پڑے۔ مشاعروں میں تو خیر اب بھی اکثر چوکے اور چھکے لگ جایا کرتے ہیں اور
بہت سے شاعر ہاتھ پیروں پر آکر۔ ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہو جایا کرتے ہیں مگر اس انقلاب کے
بعد تو نقشہ ہی کچھ اور ہوگا کہ کرکٹ کے میدان میں فضل محمود گیند لیے کھڑے ہیں اور
تماشائیوں سے کہہ رہے ہیں عرض کرتا ہوں شاید کسی قابل ہو اور یہ کہہ کر جو وہ گیند
پھینکتے ہیں تو وکٹ اڑتا ہے تو ہر طرف سے "سبحان اللہ واہ وا، کیا خوب فرمایا ہے
مکرر ارشاد" کا ایک شور برپا ہو گیا اور فضل محمود نے ہر طرف فرشی سلام کرنے

کے بعد "مکرر ارشاد" کی تعمیل میں پھر وہی گیند پھینک کر اسی طرح وکٹ اڑا دیا۔ یا حنیف نے ایک چھکا جو مارا تو ہر طرف سے داد کا شور اٹھا کہ "اے سبحان اللہ کیا برجستہ چھکا ارشاد ہوا ہے زحمت تو ہوگی ایک مرتبہ پھر" اور حنیف نے آداب بجا لا کر اور انکسار سے "میں کس قابل ہوں" کہہ کر پھر وہی چھکا مارا تو پھر شور اٹھا کہ "حضرت سیری نہیں ہوتی ایک مرتبہ تو اور" اور حنیف نے پھر تسلیمات عرض کر کے وہی چھکا مار کر کہا "دل بڑھاتے ہیں آپ حضرات۔ ایک صاف ساٹ عرض کیا ہے" اور اب جو کٹ مارتا ہے تو ایک بزرگ تماشائیوں میں سے نکل کر آتے ہیں کہ "صاحبزادے خدا عمر میں برکت دے ہم کہنہ مشقوں کے کان کاٹتے ہو" اور ان کے داد دینے پر تمام تماشائیوں نے داد کے شور سے زمین آسمان ایک کر دیئے اس لیے کہ یہ داد سند تھی اور داد دینے والے کرکٹ کے مستند اساتذہ میں سے تھے۔ حنیف کا یہ حال کہ بیٹ رکھ کر کبھی ہاتھ جوڑتے ہیں اور کبھی سلام کرتے ہیں اور باقی تمام کھلاڑی اس وقفہ سے فائدہ اٹھا کر حقہ پینے میں مصروف ہیں اور ناظرین انہی کی طرف متوجہ ہیں۔

کرکٹ کے میدان کا تو یہ حال ادھر مشاعرے میں اسکور بورڈ لگا ہوا ہے۔

حضرت عابد علی عابد	مطلع	چوکا
	پہلا شعر	بائی
	دوسرا شعر	مکرر ارشاد

	تیسرا شعر	کور ڈرائیو
	مقطع	چھکا
حضرت چرخ ستمگری	مطلع	ہوٹنگ
	پہلا شعر	پھر ہوٹنگ
	دوسرا شعر	رن آؤٹ
حضرت دلِ نادانی	مطلع	نو بال
	دوسرا شعر	ہوٹنگ
	تیسرا شعر	پنچ صدر مشاعرہ پر ہوٹنگ سامعین

اسکور بورڈ کے قریب ہی صدر مشاعرہ امپائر کے انداز سے کھڑے ہیں شاعر شعر پڑھتا ہے تو مجمع پکارتا ہے، HOW IS THAT UMPIRES? اور صدر مشاعرہ اپنا ہاتھ بلند کر کے انگلی کے اشارے سے فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ اس شعر پر دو مرتبہ داد دو، یہ چوکا ہے یا یہ چھکا ہے یا یہ کچھ نہیں اور کبھی کبھی شاعر کو شعر پڑھتے میں کیچ لیتے ہیں اس کو کیچ کرنا کہتے ہیں اور اس کے بعد شاعر نہیں پڑھ سکتا۔ ہر مشاعرے میں گیارہ شاعر ایک انجمن کے آتے ہیں اور گیارہ دوسری انجمن کے۔ پہلے ایک طرف کے شاعر پڑھتے ہیں اور دوسری انجمن کے شاعر ان کو داد دیتے ہیں پھر وہ پڑھتے ہیں اور پہلی انجمن کے شاعر داد دیتے ہیں آخر میں حساب لگایا جاتا ہے کہ کس طرف کے شاعروں نے کتنے چوکے اور چھکے مارے کتنی داد حاصل کی ہے ظاہر ہے جیت اسی کی ہوگی جس نے زیادہ داد حاصل

کی زیادہ چوکے اور چھکے مارے اور ہار اس کی ہوگی جس کے شاعر زیادہ آؤٹ ہوتے
یا کیچ کیے گئے۔

صاحب یہ محض بکواس نہیں ہے اس کے امکان بہت ہی قریب نظر آتے ہیں
امتیاز کا ایسا کرکٹ کا کھلاڑی اگر صاحب دیوان بن سکتا ہے تو حفیظ جالندھری
اور خواجہ دل محمد کو آئندہ سال ٹسٹ میچز کھیلنے پاکستانی ٹیم کے ساتھ ولایت بھیجنا
پڑے گا اس کے لیے امتیاز احمد کل پاکستان مشاعرے کی شرکت کا وعدہ کر چکے
ہوں گے اور عبدالحفیظ کاردار شاہنامہ کی باقی جلدیں لکھنے میں یہ کہہ کر مصروف ہو
جائیں گے کہ کرکٹ ٹیم کو ایک حفیظ چاہیے وہ کاردار نہ سہی جالندھری سہی اور
دنیائے شعر کو ایک حفیظ چاہیے وہ جالندھری نہ سہی کاردار سہی۔ نتیجہ یہ کہ فضل احمد کریم
فضلی کی اسکور بک شائع ہوا کرے گی اور فضل محمود کی چشم غزال۔ وقار انبالوی وقار حسن
کی جگہ لیں گے۔ اور علیم الدین، علیم الدین سالک کی

مگر سوال تو یہ ہے کہ اتنا بڑا انقلاب اگر اب تک نہیں آیا تو اب کیوں آنے لگا
اگر ایک تھانیدار شعر کہہ سکتا ہے ایک پہلوان اکھاڑے کے علاوہ مشاعرے میں بھی
جا سکتا ہے۔ ایک ریلوے گارڈ سیٹی بجا سکتا ہے اور شعر بھی سنا سکتا ہے۔ ایک حکیم
نسخہ بھی لکھ سکتا ہے اور غزل بھی تو امتیاز احمد بھی یقیناً کرکٹ بھی کھیل سکتے ہیں اور
شعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مطلب یہ کہ مشاعرے میں کرکٹ کھیلنا اور پچ پر
غزل سنانا نہ شروع کر دیں۔ اگر وہ اپنے ان دونوں مشاغل کو کامیابی کے

علیحدہ علیحدہ رکھ سکتے ہیں تو ہم خوش ہمارا خدا خوش یہ تو وہی بات ہوئی کہ "چپڑی اور دو دو"

کیمبرج کی ٹیم کے ہاتھ سے بے دریاں بولوگراں سینٹ کے گیند اور چکے ماریتو الٹا امتیاز شاعر کی حیثیت سے بھی عجیب عجیب چوکے اور چھکے مار گیا ہے جو اس کے مجموعہ کلام "میرے شعر" میں موجود ہیں۔ یہ مجموعہ چودہ نظموں، ایک غزل، قطعات رباعیوں پر مشتمل ہے اور ابراہیم جلیس کا مختصر سا مقدمہ بھی ہے جس کو دراصل مقدمہ نہیں صرف وکالت نامہ کہنا چاہیے۔ اس مجموعے کے شروع میں امتیاز نے اپنے حالات صرف یہ لکھے ہیں۔

پیدائش	جنوری ۱۹۲۸ء (پنجاب)
تعلیم	بی۔ اے تک
کالج	اسلامیہ کالج لاہور
اب تک	کرکٹ کھیلی
اب	کرکٹ سے شاعری تک اور شاعری سے پاکستانی فضائیہ تک آ گئے ہیں۔

اس میں آئندہ کا ذکر نہیں ہے جو ازروئے قاعدہ یہ ہونا چاہیے۔

آئندہ	پاکستانی فضائیہ کے بعد پرواز تخیل کا ارادہ ہے جس کی ابتدائی مشق جاری ہے۔

اس مجموعے کی پہلی نظم جس سے مجموعے کا نام لیا گیا ہے "بیسوے شعر" سے فرماتے ہیں" ؎

ہم نشیں مجھ پر گزرتا ہے اک ایسا وقت بھی
زندگی کے سارے ہنگاموں سے بھٹک جاتا ہوں
تنگ تر ماحول کے حلقے سے گھبراتا ہوں میں

اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے نتیجہ یہ کہ ؎

چند لمحے سکوں لہروں میں بہہ لیتا ہوں میں   ہاں اسی عالم میں کھو کر شعر کہہ لیتا ہوں میں

یہ نظم امتیاز کی دوسری نظموں سے نسبتاً کمزور ہے ...... بس یہ سمجھیے کہ جیسے کوئی مشاق بیٹس مین ندرد ار بولنگ ——— کے ہاتھ تو دکھا جائے گا مگر کوئی چوکا یا چھکا نہ مار سکے امتیاز کی دوسری نظموں میں بڑے بڑے چوکے اور چھکے بھی نظر آتے ہیں اور اس مصور نے ایسی ایسی شاہکار تصویریں بھی پیش کی ہیں جن کا ہر رنگ چوکھا ہے۔ اپنی نظم "تنہائی" میں فرماتے ہیں".

زندگی ایک پر اسرار دھندلکا بن کر   میرے الجھے ہوئے احساس پہ چھا جاتی ہے
سہمی سہمی سی فضاؤں کے ہر اک گوشے سے   اجنبی جسم کی بھرپور مہک آتی ہے

اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ پوچھنے بیٹھ جائیں کہ کیوں صاحب یہ فضاؤں کے گوشے کیا چیز ہیں۔ مگر اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اپنے ذوق سلیم سے کام لے کر "فضاؤں" کو "ہواؤں" پڑھ کر لطف اٹھائیے محض اعتراض کی وجہ سے مزہ کرکرا نہ کیجیے۔ امتیاز کی نظم "اندیشہ" مجھے خصوصیت سے پسند آئی اور میں چاہتا ہوں کہ اسے

سب ہی پسند کریں کہتے ہیں ؎

تیرے خاموش لبوں پر یہ تبسم کی نمود — تیری چپ چاپ نگاہوں میں یہ الفت کا پیام
یہ تو سچ ہے کہ یہ آغاز حسین ہے لیکن — کون جانے کہ اس آغاز کا کیا ہو انجام

اور اس نظم کا آخری شعر جس میں پورا اندیشہ موجود ہے کس قدر بے تکلف اور برجستہ ہے ؎

یہ عنایت یہ نوازش یہ توجہ یہ کرم — چند لمحات کی تسکین کا سامان تو نہیں

امتیاز نے اپنی نظم "چہرے" لکھ کر ثابت کیا ہے کہ وہ صرف کرکٹ کا کھلاڑی ہی نہیں بلکہ زندگی کے بعض نازک حقائق پر بھی اس کی گہری نظر ہے اس نظم کے بھی دو بند ملاحظہ ہوں ؎

میری نظروں میں مری یاد کی محرابوں میں — کتنے خاکے ہیں کہ اس وقت بھی منڈلاتے ہیں
جن کے دم سے ہے تعمیر مری دنیائے خیال — ایک اک کر کے وہ سب نقش ابھر آتے ہیں

پھر کچھ ساتھیوں کا ذکر ہے جو عمر بھر کا پیمانِ وفا باندھ کر ع

جانے کس وقت کس عالم میں مجھے چھوڑ گئے

کچھ احباب ہیں جو محبت کے نقیب بنے مگر یہ ہے کہ اب ان کی عنایات کی یاد اور خود ان کا خیال تک -

صرف اک تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

اور پھر کچھ شفق ہونٹ کچھ جوان جسم اور کچھ گلابی بانہیں ہوتی ہیں جن کی خاموش نگہ سے

نے شاعر کو سند میں بھیجے تھے گر ان سب سے شاعر نے صرف یہ لکھا ۔

میں نے ہر موڑ پہ انسان کا نیا رخ دیکھا تجربوں میں بھی مجھے ایک نیا کیف ملا
جب بھی اس دل پہ کوئی زخم لگا چوٹ پڑی میں نے جا کے گلشن میں نیا پھول کھلا

امتیاز نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ نظم گو شاعر ہیں غزل گو شاعر نہیں ہیں یہی وجہ ہے اس مجموعے میں ان کی ایک بھی مکمل غزل نہیں ہے۔ مگر ان کی اس نامکمل غزل کے بھی دو شعر پڑھیے ۔

اک کرن تھی کہ دل میں اتر گئی نگہ اولیں کی بات نہ پوچھ
ذکر وہم و گماں بھی چھیڑو کبھی صرف علم و یقین کی بات نہ پوچھ

اور اب ان کی ایک مختصر سی مثنوی کے بھی چند شعر

ہل کچھ کہتے ہیں زبان خاموش دل کی دھڑکن کی داستان خاموش
چھپی زرد زردیاں کیسی یہ غم انگیز پہیلیاں کیسی !!
وحشت یک نفس ہے غم نہ کرو جانے یہ وقت کب عبور ہو
تم نے دیکھا نہیں کہ عشق یہاں اک تجارت ہے کس قدر ارزاں
حسن فانوس کی تہہ میں جلتا ہے عشق گھٹ گھٹ کے زہر پیتا ہے

ان مجموعے سے چند یہ نمونے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ امتیاز کی شاعری کے بارے قائل ہو جائیے۔ ورنہ حضرت جگر مراد آبادی سے مولانا عبد المجید سالک سے احمد ندیم قاسمی سے عابد علی عابد سے، احسان دانش سے اور آپ کو اختیار ہے

جس شاعر سے بھی آپ کا جی چاہے کرکٹ کھلوا کر ہم کو دکھا دیجئے، یہ لوگ اناڑی ہی نہ ثابت ہوں تو ہمارا ذمہ کم سے کم اتنا اناڑی تو نہیں معلوم ہوتا!!

پڑوسی

آج کل جسے مکان مل جائے سمجھ لیجئے کہ یا تو وہ راشی ہے کہ اپنی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ کرایہ دے کر اپنی حیثیت سے کم درجے والے مکان میں رہتا ہے۔ ورنہ وہ واقعی اس خاندان کا ایک خوش نصیب فرد ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؔ نے فرمایا ہے۔ ع

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

بہرحال آپ کو یقین آئے نہ آئے لیکن میں آپ کو یقین دلانے کی کوشش سے یہ کہہ کر سبکدوش ہونا چاہتا ہوں کہ میں واقعی راشی نہیں ہوں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ رشوت لینے کے مواقع ہی مجھے حاصل نہیں۔ اب رہ گئی دوسری بات کہ میں خوش نصیب ہوں یا نہیں، اس کے متعلق میں خود کیا کہوں۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ مجھے ایک مکان کا نصف حصہ عین خانہ بدوشی کے عالم میں مل گیا۔ اور اگر سچ پوچھئے تو یہ مکان ملنے کے بعد ہی سے قسمت نے اپنے رنگ دکھانا شروع

کیجئے۔ اب خواہ آپ اسے خوش قسمتی سمجھیں یا بد قسمتی۔

یہ مکان جو مجھے ملا ہے یہ در اصل کوٹھی کے طور پر بنایا گیا تھا۔ پھر شاید کسی کارخانے کی صورت سے استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد غالباً اصطبل کی حیثیت اسے حاصل رہی اور جب مکانوں کی قلت نے انسان اور گھوڑے کے فرق کو یکسر ختم کر دیا تو اب اس مکان کا نصف حصہ مجھے ملا ہے، اور نصف حصے میں میر صاحب رہتے ہیں تین کمرے اور ایک غسلخانہ اُن کے پاس ہے اور تین غسل خانے اور کمرہ میرے پاس ہے اور بیچ میں پلائی وڈ کا ایک پارٹیشن لگا کر زبردستی اس مکان کو تقسیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں مکان کی شکایت کر رہا ہوں۔ اس کفرانِ نعمت سے خدا بچائے مجھ کو۔ مجھے تو منھ مانگی مراد ملی ہے۔ اس مکان کی شکل میں پھر پڑوسی میر صاحب بھی ایسے شفیق بزرگ۔ یاں کہ جس وقت میں اپنا سامان لے کر پہنچا ہوں یہ بزرگ محترم ایک غرقی باندھے۔ ہاتھ میں پنکھا لیے باہر نکل آئے مجھے عینک لگا کے پہلے تو دور ہی سے سونگھتے رہے اس کے بعد قریب آ کر بولے

"تو گویا آپ نے لیا ہے یہ مکان؟

عرض کیا۔

جی ہاں۔ اور آپ غالباً اس مکان کے نصف حصے میں ہیں؟"

بہت ہی اخلاق سے بولے جی ہاں۔ اس خاکسار کو میر علی حسین کہتے ہیں بھئی آپ کے سامان میں تو بڑی کام کی چیزیں ہیں۔ اللہ اکبر۔ اتنی تو محض

کتابیں ہیں

کتابیں ہیں۔ چلو کتب بینی کا سہارا ہوا اسی شغل میں وقت کٹ جایا کرے گا۔ اور یہ کیا ، کلاک ہے ۔ بھئی بہت ہی اچھا کیا آپ لے آئے گھڑی۔ جب سے اس مکان میں ہوں دھوپ دیکھ دیکھ کر وقت کا اندازہ کیا کرتا ہوں۔ اب کم سے کم صحیح وقت تو معلوم ہو جایا کریگا یہ گھڑی میرے برابر والے کمرے میں لگا دیجئے"

میں ہاں ہوں کہہ کر سامان اُترواونے میں معروف ہو گیا اور منیر صاحب ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے رہے۔ کبھی کسی میز کی قیمت پوچھتے کبھی کسی مسہری پر تبصرہ فرماتے کبھی سامان رکھوانے کے سلسلے میں اپنے مشوروں سے مستفید فرماتے اور کبھی نہایت مُربیانہ انداز سے تسلی دیتے جب تک میں موجود رہوں آپ کو اس گھر میں کوئی تکلیف نہ ہوگی مختصر یہ کہ منیر صاحب کے زیر سایہ تمام سامان ٹھکانے سے لگا دیا گیا۔ اور اُن کی خواہش کے مطابق میں نے اپنا کمرہ وہی رکھا جو منیر صاحب کے ذاتی کمرے سے ملا ہوا تھا۔ اور دونوں کمروں کے بیچ میں پلائی ووڈ کا پارٹیشن تھا اسی کمرے میں کلاک لگا دیا گیا اور اسی کمرے میں کتابیں قرینے سے لگا دیں اور لکھنے کی میز بھی اسی کمرے میں رکھی ۔ واضح رہے کہ یہ سب کچھ منیر صاحب کے ارشاد کے عین مطابق کیا گیا۔ اس لیے کہ اُن کی توجہ نے تو مجھ جیسے ناچیز کو بندہ بے دام ہی بنا لیا تھا اتنی ہی دیر میں ۔

دن تو جوں توں کٹ گیا۔ لیکن جب رات آئی تو گھوڑے بیچ کر سونے کا ارادہ کیا۔ اس لیے کہ تھک کر چور ہو چکے تھے دن بھر گھر کو ٹھیک ٹھاک کرتے کرتے ۔ لیکن ابھی

بستر پر پہنچے ہی تھے کہ آدھ گھنٹہ غائب ہو گیا۔ میر صاحب بھی اپنے بستر پر آگئے اور دیکھ سے بولے۔

"میں نے کہا کیا ارادہ ہے؟"

عرض کیا۔ "قبلہ اب تو سونے کا ارادہ ہے بہت تھک گیا ہوں"۔

کہنے لگے۔ "بیشک۔ بیشک۔ مگر سر شام ہی سو جاؤ گے کیا؟"

عرض کیا۔ "دس بجنے والے ہیں"۔

کہنے لگے۔ "میں تو یہی کہہ رہا ہوں کہ سر شام ہی سونے کا ارادہ ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں آج تو یہی ارادہ ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہے اور تھکاوٹ کا شدید اثر ہے"۔

میر صاحب نے اس کے جواب میں تھکاوٹ دور کرنے کے کئی آزمودہ اور مجرب نسخے سنا دیئے۔ پھر آج کل کے جوانوں کا اپنی بوڑھی ہڈیوں سے مقابلہ کرتے رہے اور اپنی جوانی کے زمانے کی داستان کچھ اس طرح چھیڑی کہ جس وقت وہ بالٹی منہ سے لگا کر سیر ڈیڑھ سیر دودھ غٹاغٹ پینے کا ذکر کر رہے تھے مجھے نیند نے آگھیرا اور میں ایسا بے سدھ سویا کہ اس وقت آنکھ کھلی جب شدید زلزلہ آیا ہوا تھا۔ اور میر صاحب پلائی وڈ کے پارٹیشن پر مسلسل بینڈ بجا رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر آنکھ کھول دی اور گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میر صاحب کی آواز پھر آئی۔

"ارے بھئی کیا واقعی سو گئے ؟"

میں نے اپنی رسید دیتے ہوئے عرض کیا۔

"کیا بات ہے میر صاحب ؟"

میر صاحب نے ہنس کر فرمایا۔ "کیا جوانی کی نیند سوتے ہو۔ آدھ گھنٹے سے جگا رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا ــ خیریت تو ہے ؟"

کہنے لگے۔ "وہ مجھے کہنا یہ تھا کہ جو جمعدار اس گھر میں لگا ہوا ہے نہایت کام چور ہے۔ کہیں تم اُسے نہ رکھ لینا"

عرض کیا جی ہاں، اس سلسلے میں صبح باتیں ہوں گی۔ اس وقت تو نیند کا سخت غلبہ ہے۔"

کہنے لگے۔ "ہاں ہاں تو سو جاؤ نا۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ وہ کمبخت صبح ہی صبح آجائے گا۔ کہیں تم اُس سے طے نہ کر لینا۔ اور دودھ والے کا انتظام بھی تمہارے لیے میں کر دوں گا۔ میں جس سے دودھ لیتا ہوں اُس کا دودھ کہیں اچھا ہوتا ہے کیا مجال کہ ایک قطرہ بھی پانی کا ملائے۔ ورنہ یہ کمبخت تو دودھ میں پانی تھوڑی ملاتے ہیں۔ پانی میں دودھ ملاتے ہیں۔ اس سے تو نل کا پانی پی لیا جائے۔ اور ابھی وہ نل پر خیال آیا کہ اپنے ہی بھتیجی سے کہہ دوں گا کہ تمہارے یہاں بھی پانی ڈال دیا کرے کتنی مشکیں چاہیئے ہوں گی ؟"

میں نے نیند کی غنودگی میں کہا۔

"جتنی آپ مناسب سمجھیں"۔

کہنے لگے "بس ایک صبح، ایک شام کافی ہو گی۔ لیکن کل تو تمہیں غالباً کمرے بھی دُھلوانا ہوں گے۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی شکیں آجائیں۔ تو کتنی مشکوں کو کہہ دوں؟"

میں نے اُسی غنودگی میں کہا۔

"تین، چار، چالیس، پچاس۔"

وہ ایک دم چیخے — "ایں — کیا کہا چالیس پچاس؟"

میں اس چیخ پر پھر چونک پڑا — "صبح دیکھا جائے گا صاحب! اس وقت تو سو جانے دیجیے"۔

تمیر صاحب غالباً احتجاجاً چپ ہو گئے۔ لیکن اُسی وقت کلاک نے آدھا جو بجایا تو وہ پھر بولے۔

"یہ کیا بجا رہی ہے گھڑی؟"

میں نے کہا۔ "آدھا"۔

وہ بھلا اس مختصر جواب سے مطمئن ہونے والے کہاں! کہنے لگے۔ "صاحب آدھا تو میں نے بھی سنا ہے۔ مگر یہ ڈیڑھ بجا ہے یا ڈھائی؟"

میں نے کہا۔ "غالباً ڈیڑھ بجا ہے"۔

کہنے لگے "یہ خوش ڈیڑھ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو پہلے ہی بج چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر یہ ڈھائی کا آدھا ہوگا۔"

کہنے لگے۔ "بندہ نواز! گھڑی قیاس آرائیوں کے لیے تو نہیں ہوتی۔ ذرا بتی جلا کر دیکھ لو تاکہ اطمینان ہو جائے۔"

سوال یہ ہے کہ آخر آدمی کہاں تک ضبط کرے۔ میں جھلا کر اٹھ بیٹھا اور میر صاحب سے کہا۔ "صاحب یہ تو چھ گھنٹے میں اٹھائیس مرتبہ کچھ نہ کچھ بجاتی ہی رہتی ہے اب آخر کہاں تک اس کے ایک ایک آدھے پر غور کیا جا سکتا ہے؟"

اور یہ کہہ کر بتی جلا کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیجیے نہ ڈیڑھ، نہ ڈھائی بلکہ ساڑھے تین کا آدھا بجا تھا یہ۔"

میر صاحب نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ اب سونا ہی بیکار ہے تھوڑی ہی دیر میں اذان ہونے والی ہے۔"

اب میں نے بہت لجاجت سے کہا۔ "لیکن مجھے سو جانے دیجئے۔ ورنہ میں بیمار ہو جاؤں گا۔"

میر صاحب نے بڑا احسان فرمایا۔ "اچھا بھئی تم سو جاؤ اب اطمینان سے مگر میری تو ساری رات آنکھوں ہی میں کٹ گئی وہ بلا کی خشکی ہے دماغ میں کہ نیند کمبخت آتی ہی نہیں۔ بخدا یہ چوتھی رات تھی جو آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا حالانکہ اس کے بعد بھی اپنے دماغ کی خشکی

کی داستان سناتے رہتے کہ اس کمبخت کو دور کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے۔ کس کس کا علاج کیا۔ روغنِ بادام میں اپنے کو ڈبوتے رکھا مگر یہ خشکی دور نہ ہوئی بہر حال وہ اپنی داستان سناتے رہتے اور اس داستان سے ہم لوری سننے کا کام لیتے رہتے یہاں تک کہ غافل ہو گئے۔ لیکن کس کے لیے صبح پھر وہی پانی والے کے پارٹیشن پر میر صاحب کے گھونسے پڑ رہے تھے۔ آنکھ جو کھلی تو گھڑی میں ابھی سات بھی نہ بجے تھے۔ جی چاہا کہ میر صاحب کی خدمت میں یہ پارٹیشن ہٹا کر جوابی گھونسے پیش کیے جائیں لیکن ضبط کر کے رہ گئے۔ اور اس بیماری کو ختم کرنے کے لیے کہا میں جاگ اٹھا ہوں میر صاحب! فرمائیے کیا بات ہے؟

کہنے لگے ارے بھئی اب تو دوپہر ہو گئی ہے کہ آئے بندۂ خدا۔ اب تو اٹھو ایسا بھی کیا سونا۔ ساری رات تو سوئے ہو۔

اپنے غصے میں خود ہی پیچ و تاب کھا کر رہ جانا پڑا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلنا تھا کہ میر صاحب آ موجود ہوئے۔ اور پھر اپنے مشوروں سے مالا مال کرنا شروع کر دیا کہ اس دھوبی کو نہیں اس دھوبی کو لگاتا۔ اس قصائی کے یہاں سے نہیں جس قصائی کے یہاں سے گوشت منگاتا۔ اس راشن ڈپو سے راشن لیا اور اس ڈاکٹر سے علاج کراتا۔ آج ہی سے میر صاحب سے صاف صاف باتیں بھی کر لیں کہ مجھے بندہ نوازا میں ٹھہرا گھنٹے پڑھنے والا آدمی۔ اگر آپ نے اس طرح پارٹیشن بجا بجا کر مخل ہونے کا سلسلہ جاری رکھا تو واللہ خدا مشکل ہی سے رہ

سکے گا۔ لیکن میر صاحب اس طرح کی باتیں اس کان سن کر اُس کان اُڑا دینے کے فن سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ اُس وقت تو چپ ہو گئے۔ بلکہ ٹل بھی گئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پارٹیشن کے ایک روزن سے جھانک کر بولے۔

"یہ کیا لکھائی ہو رہی ہے؟"

میں نے اپنے کو لکھنے میں مصروف رکھتے ہوئے کہا

"کچھ ضروری کام کر رہا ہوں"

کہنے لگے "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر زیادہ جھک کر نہ لکھا کرو اس سے کوبڑ نکل آتا ہے"

اور میں واقعی "کوبڑ" کی روانی میں "گڑبڑ" لکھ گیا جس کا فوراً احساس بھی ہو گیا۔ اب میں نے اپنے غصے کو بمشکل تمام پی کر قلم رکھ دیا۔ اور فوراً تلخی سے کہا۔

"بہتر یہ ہے کہ اگر آپ نہیں چاہتے کہ میں لکھوں تو نہیں لکھتا۔

وہ بولے "یعنی گویا میں نہیں چاہتا کہ آپ لکھیں۔ لو بھلا میں کیوں چاہوں گا۔ بلکہ میں تو خود آپ کو لکھتا ہوا دیکھ کر خوش ہو گیا تھا اور انتظار تھا کہ کسی وقت آپ سے عرض کروں گا کہ والد مرحوم کے سوانح حیات لکھنا چاہتا ہوں تاکہ دنیا کو معلوم تو ہو سکے کہ کتنی بڑی ہستی خاموشی سے گزر گئی اس دنیا سے۔

میں نے کہا۔ "میرا بھی یہی ارادہ ہے"۔

کچھ نہ سمجھ کر بولے۔ "کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

عرض کیا "نہیں کہ اس دنیا سے گزر ہی جاؤں. لیکن میں خاموش نہیں گزروں گا اپنی اور آپ کی جان ایک کر کے گزروں گا۔ آپ کو اپنے سفرِ آخرت کا شریک سفر بناؤں گا آپ کے سر سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مروں گا۔ آپ نے کل سے میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ یہ مکان میرے لیے دفتر ہے جس میں آپ عذاب کے فرشتے کی طرح نازل ہوتے ہیں مجھ پر"!

اور میں واقعی نہ جانے کیا کیا کہہ گیا میر صاحب وم بخود سب کچھ سنتے رہے اور اب جو دیکھتا ہوں تو شربت بید مشک کا ایک گلاس لیے کھڑے ہیں لیکن مجھے اس کے باوجود تسلی نہ آئی۔ اس لیے کہ میں اب پھر مکان ملنے کے باوجود مکان کی حسرت اپنے اوپر طاری کیے ہوئے تھا۔ اور میر صاحب مسلسل سمجھا رہے تھے۔ "اس قسم کے دورے مراق اور جنون کا مقدمہ ہوتے ہیں" اور میرا جی چاہا کہ میں انھیں قتل کر کے مقدمہ واقعی چلوا لوں!

ذرا ترنم سے

مشاعرہ جیسا کہ عام طور پر مشاعرے ہوا کرتے ہیں انڈو پاکستان مشاعرہ تھا خواتین کے لیے پردے کا مناسب اور حضرات کے لیے بے پردگی کا مناسب انتظام بھی اس میں تھا چنانچہ شامت جو آئی تو بیوی کو بھی ساتھ لے کر پہنچ گئے کہ ذرا وہ بھی تو اندازہ کریں کہ ان کے شوہر کا جو شخص معترض ہے وہ ہے کس پایہ کا انڈو پاکستانی انسان. بہرحال بیوی کو پردے کے مناسب انتظام میں بٹھا دیا اور خود ڈائس پر آ گئے جہاں شعرائے کرام کے لیے نشست کا بندوبست تھا. ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور چیخ و پکار کے ساتھ ہی ساتھ تالیوں اور سیٹیوں کا ایک ہنگامہ برپا تھا کہ یکایک لاؤڈ سپیکر کی آواز ہال میں گونج اٹھی اور جناب صدر نے مشاعرے کے آغاز کا اعلان فرمایا تالیاں تھمیں، سیٹیاں بند ہوئیں اور شاعر کا ترنم میں مرتا ہوا اشلوک سامعین کی سماعت پر یوں پڑا کہ کسی نے داد دی کسی نے بلے بلو سے کام لیا. کوئی آواز پر مچل اٹھا کسی نے

بندش کی کمزوری چن بنایا۔ مگر شاعر ان سب سے بے نیاز اپنی غزل سناتا رہا اور مقطع پر تالیوں کی بارش ہی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جناب صدر ایک کے بعد دوسرے شاعر کے نام کا اعلان کرتے رہے سامعین کبھی کسی کی ہنسی اڑاتے رہے اور کسی کو بانس پر چڑھاتے رہے۔ کوئی قسمت کا دھنی پوری غزل پڑھ گیا تو کسی کو پہلے ہی شعر پسپا ہونا پڑا۔ کسی کی غلط نامزدی گئی تو کسی پر سسکاریاں بھری گئیں۔ کوئی اپنے اوپر تالیاں ٹوٹ پڑا کیا۔ کسی نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ سامعین اپنی کہتے رہے اور وہ اپنی سناتا رہا۔ یہاں تک کہ جناب صدر نے ہمارے نام کا بھی اعلان کر دیا۔ ویسے آج خیر موت برحق ہے ہی۔ مگر یہ وقت نامناسب اس لیے تھا کہ ابھی ایک نہایت خوش گلو اور ترنم پیا شاعر ایک سماں باندھ کر اور اپنا رنگ جما کر گیا تھا۔ اور یہ یہ حال ہے کہ آواز بھی واجبی سی ہے اور موسیقی سے بھی کوئی لگاؤ نہیں۔ مگر یہ بات خود اپنی سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ آخر ہم غزل کیوں پڑھتے ہیں۔ بہرحال چونکہ غزل بھرپور ترنم کی نہیں لہذا دل کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ صرف آواز ہی نہیں کلام بھی کوئی چیز ہے۔ چنانچہ اب جو مطلع پڑھتے ہیں تو ایک قیامت برپا ہو گئی محسوس یہ ہوا کہ جیسے ہال کی چھت اڑ گئی۔ جناب صدر نے میز پر دونوں ہاتھ مار کر کہا

"حضرات یہ طریقہ آداب مشاعرہ کے خلاف ہے۔ ذرا اطمینان سے شعرا کا کلام سنیے"

چنانچہ اس اعلان کے بعد جب ذرا سکون ہوا ہم نے شعر پڑھ دیا۔

اس مرتبہ یقیناً سکون رہتا اگر سامعین میں سے کسی سخن ناشناس نے رونے کی آواز بلند کر کے سامعین کو ایسا جھنجھلایا کہ خود جناب صدر بھی منہ پر رومال رکھے دیر تک نہ جانے روتے رہے یا ہنستے رہتے۔ اسی وقت مشاعرے کے سیکرٹری صاحب نے آکر ہمارے کان میں کہا "تحت اللفظ پڑھیے" مگر اب جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں تو مختلف گوشوں سے آوازیں بلند ہوئیں "ترنم سے، ذرا ترنم سے" جناب صدر نے ہاتھ اٹھا کر ان کو خاموش رہنے اور ہم کو پڑھے جانے کا ارشاد فرمایا چنانچہ ہم تحت اللفظ پڑھتے رہے اور سامعین کا ترنم کے لیے اصرار اس حد تک بڑھا کہ آخر ہم نے پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور اب جو ترنم شروع کرتے ہیں تو خود بھی اندازہ ہوا کہ بے سُرے ہو گئے ہیں اور سامعین نے بھی اپنے قہقہوں اور تالیوں سے اس کی تائید کر دی۔ سیکرٹری مشاعرہ نے پھر لپک کر کان میں کہا "بس اب مقطع پڑھ دیجیے" مگر ہم چاہتے تھے کہ غزل کے آخری چند شعر جو واقعی غزل کی جان تھے، ضرور سنا دیں، مگر مصیبت یہ تھی کہ نہ تو آواز قابو میں آتی تھی نہ سننے والے، کئی مرتبہ مائکروفون میں منہ ڈالا مگر حاضرین تو اب باقاعدہ سیٹیاں تک بجانے لگے تھے اور تالیاں کورس میں پیٹی جارہی تھیں لہذا سیکرٹری مشاعرہ نے سہارا دیا اور ہم اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ معلوم نہیں تمام جسم سے چنگاریاں کیوں نکل رہی تھیں پسینے کے وہ کون سے سوتے تھے جو پھوٹ پڑے تھے۔ قریب بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ آواز شاعر نے کہا "[illegible] یہ مشاعرہ ہے" اور ہم نے رومال سے پیشانی کا پسینہ پونچھ کر

اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ مشاعرہ جاری رہا۔ شعرا کلام سناتے رہے مگر ہم اس وقت کو بیٹھے کوس رہے تھے جب بیوی کو ساتھ لانے کا ارادہ کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے مشاعروں میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ اب سے پہلے بھی نہ جانے کتنے مشاعروں میں یہی صورت پیدا ہو چکی تھی، اور اس وقت تک پیدا ہوتی رہے گی جب تک سامعین کا مذاق اس حد تک نہ سدھر جائے کہ وہ میوزک کانفرنس اور مشاعرے میں امتیاز کرنا شروع کر دیں مگر سوال تو یہ تھا کہ بیوی کو آخر کیوں ساتھ لائے اور اب ان کو کس طرح سمجھائیں گے کہ یہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں بلکہ سننے والوں کی کور ذوقی تھی یہ۔ ایمان کی بات یہ تھی کہ اس وقت شاعر حضرت شوہر تھا اور اس کو اپنی شاعرانہ نہیں بلکہ شوہرانہ عظمت کے لالے پڑے ہوئے تھے، آخر سمجھ میں یہی آیا کہ اس طرح چور بننے سے کام نہ چلے گا۔ بلکہ ذرا ڈھٹائی سے کام لینے کی ضرورت ہے تاکہ بیوی کو یہ سمجھا سکیں کہ مشاعرے کی کامیابی ایسی کہلاتی ہیں جو ہم کو حاصل ہوئی ہے وہ بیچاری گھر کی بیٹھنے والی ٹھہریں۔ ان کو کیا معلوم کہ یہ سب کچھ کیا ہوا البتہ ان کو سمجھانے کے لیے ڈھنگ ذرا مناسب سا ہو تو اچھا ہے چنانچہ اپنے کو اس مناسب ڈھنگ کے لیے تیار کرتے رہے اور مشاعرہ ختم ہونے تک ہم اپنے کو بالکل سنبھال چکے تھے چنانچہ ذرا خود سے نکلے باہر بیوی کے انتظار میں کھڑے ہی تھے کہ ایک برقع والی نے ایک دوسری برقعہ والی کا برقع کھینچ کر کہا

"دیکھا یہ رہی ہیں ماں بیٹی"۔

اور اس نے جواب دیا "ہائے ہے سبحان اللہ! یہ بچی کتنی گوری ہے، اتنی گت بنی سنگھر اچھی رہی ہے"۔

ہر چند کہ یہ آوازیں نہایت واضح تھیں مگر ہم گویا اپنے سر اٹھائے سنی ان سنی کر دی۔ اتنے میں کچھ اور معزز خواتین اندر سے نکلیں، ہم کو دیکھا چلتے چلتے رکیں اور ایک دم سب مل کر ہنس دیں۔ ہم اس ہنسی کے بھی مخاطب نہ بنے اور ذرا سا آگے بڑھ گئے اب کی مرتبہ ایک خاتون نے اپنی بچی کے کان میں کچھ کہا، اور اس بچی نے ہم کو دیکھ آواز لگائی۔ ذرا توقف سے اور کچھ مستورات کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ان حالات میں مناسب یہی معلوم ہوا کہ یہاں سے ٹل جائیں۔ لہذا ذرا دور ہٹ کر بیوی کی آمد کا انتظار کرنے لگے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مصیبت اپنا شکار خود ہی ڈھونڈھ لیتی ہے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحبزادی نہایت متانت سے آٹو گراف بک اور قلم لے کر آگے بڑھیں۔ ہم نے قلم لے کر آٹو گراف کے طور پر صرف دستخط کر دیے مگر انہوں نے اصرار کیا کہ دستخط کے علاوہ کچھ اور لکھ دیجئے۔ مگر ذرا توقف سے، اور یہ کہہ کر جو ہنسی ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ اکیلی نہ تھیں بلکہ ان سے کچھ فاصلے پر اور لڑکیاں بھی تھیں جو ہنسی کے دورے میں مبتلا تھیں۔ ہم نے قلم اور آٹو گراف بک ان کو تھما کر یہاں بھی ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک مجمعے کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ سب کے بعد بیوی صاحبہ تشریف لائیں۔ اور ان کو لے کر ہم ایک تانگے پر روانہ ہو گئے

مگر اب وہ ہیں کہ چپ اور ہم ہیں کہ ان کو سمجھانے کے لیے الفاظ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ بمشکل تمام جی کڑا کر کے کہا۔

"دیکھ لیا آپ نے مشاعرہ؟"

وہ بڑے طنز سے بولیں "جی ہاں۔ دیکھنا ہی پڑتا ہے جو قسمت دکھائے"

ہم نے بے حیائی لاد کر کہا، "کیا مطلب۔ یعنی پسند نہیں آیا مشاعرہ"۔

وہ جل کر بولیں "بھلا پسند نہ آتا۔ اتنی تو عزت افزائی ہوئی آپ کی اور مجھ کو پسند نہ آتا۔ ہائے بے فکرے پھولی نہیں سماتی میں تو"۔

ہم نے بمشکل ہنس کر کہا "اوہو آپ سمجھیں نہیں۔ صاحب یہ تو مشاعرہ ہے اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے جو جتنا مقبول شاعر ہوتا ہے اتنے ہی حاضرین اس سے بے تکلف ہوتے ہیں"۔

وہ جھلا کر بولیں "چولھے میں گئی یہ بے تکلفی اور بھاڑ میں گیا مشاعرہ۔ آپ کا کیا گیا گھڑوں پانی تو مجھ پر پڑ گیا"۔

ہم نے بڑی معصومیت سے کہا "گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ کیسے؟"

وہ بدستور بیزاری سے بولیں "سات سلام ہیں اس نگوڑی شاعری کو جو آدمی کو ایسا بے عزت بنا دے، جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔

ہم نے اب بھی ہنس کر کہا "وہ جو یہ کہ مشاعرہ تم نے دیکھا جو نہیں کبھی۔ غالباً

تم اس کو کچھ بے عزتی کی بات سمجھی ہو۔

انھوں نے برقعہ کا نقاب الٹ کر بڑے جوش سے کہا "اور آپ اس کو عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے ایسے ایسے آوازے کسے گئے ہیں کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ ایک بولی "جانے یہ موا کیوں رونے کھڑا ہو گیا ہے" دوسری نے کہا "ہائے میرے اللہ اس آواز کے فقیر کو تو بھیک بھی نہ دینا چاہیے" کسی نے کہا "اس سے کہو آگے بڑھے" کوئی بولی "لے یہ موا ہے کون۔ اور تو اور ایک بڑی بی مجھ ہی سے پوچھ بیٹھیں کہ اس نگوڑ مارے سے کس نے کہا ہے کہ شاعری کرے آکر مجھ سے کیوں نہیں پوچھتا، یہ ہے کون آخر۔ اب میں کیا کہتی کہ یہ میرے سرتاج ہیں۔"

ہم نے ہنس کر کہا "اسی لیے تو عورتوں کو ناقص العقل کہتے ہیں۔"

وہ جل کر بولیں "جی ہاں۔ باہر عقل کے ٹھیکیدار بھی جناب کے ساتھ جو سلوک کر رہے تھے وہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔

ہم نے ان کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر کہا "بے وقوف! بزم مشاعروں میں تو اسی قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں، بہر حال جو سمجھدار لوگ تھے وہ اصل کلام پر سر دھن رہے تھے۔

وہ منہ بنا کر بولیں "خاک سر دھن رہے تھے۔ وہ اللہ جانتا ہے اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس مشاعرے نگوڑ مارے میں حمیدہ اور سعیدہ اور رشیدہ بھی آئیں گی اور

تمہاری یہ گت بنے گی تو کبھی نہ آتی یہاں۔"

ہم نے چونک کر کہا "تو کیا حمیدہ وغیرہ بھی آئی تھیں؟"

وہ بولیں "یہی تو رونا ہے کہ اب میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ حمیدہ بار بار کہہ رہی تھی کہ نہ جانے دولہا بھائی کیوں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس پر رشیدہ نے اس کو ٹوکا کہ دولہا بھائی تو نہ کہو سب کے سامنے ورنہ اپنا بھی مذاق اڑے گا۔ سعیدہ نے تو ایک عورت سے جھگڑا ہی شروع کر دیا کہ اس نے مردوا کیوں کہا۔"

ہم نے ذرا گھبرائی ہوئی ہنسی ہنس کر کہا "لاحول ولا قوۃ۔ بات یہ ہے کہ آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ مشاعرے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ مقصد اصل میں یہ ہے کہ اتنے بڑے مشاعرے میں تمام شاعر تو ہوتے نہیں۔ خاص خاص شاعر ہوتے ہیں چھوٹے موٹے حاضرین چاہتے ہیں کہ ان سے اپنی بے تکلفی کا اظہار کر کے ایک دوسرے پر یہ ظاہر کریں کہ اس بلند پایہ شاعر کی خدمت میں ہم اس حد تک گستاخ ہیں۔ بہرحال مشاعرے کے اس ہلڑ کا معلوم ہوتا ہے آپ نے غلط نتیجہ نکالا ہے"

... تانگہ گھر پہنچ چکا تھا لہذا یہ بحث ختم ہو گئی اور چونکہ رات کافی آ چکی تھی لہذا اس وقت تو سب سو رہے مگر صبح جو اٹھے ہیں تو بیوی پر جو بیوگی طاری تھی وہ دیکھی نہ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ٹھنڈی آہیں لبوں پر منجمد ہو گئی ہیں اور خشک ہونٹیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ۔ ؎

اشک یوں بھی بہائے جاتے ہیں

ہم اس وقت تو دفتر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے مگر سہ پہر کو دفتر سے آ کر گھر میں عجیب سناٹا محسوس ہوا۔ ملازمہ سے معلوم ہوا کہ حمیدہ، سعیدہ اور رشیدہ آئی ہوئی تھیں جو ابھی واپس گئی ہیں۔ اور بیگم صاحبہ کو بخار ہے وہ اپنے کمرے میں اوڑھے لپیٹے پڑی ہیں۔ بلکہ ملازمہ نے دبی زبان سے یہ بھی کہا کہ شاید کسی کا انتقال ہو گیا ہے اس لیے کہ بیگم صاحبہ برابر روتی رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خبریں سن کر سخت پریشان ہوئے اور بیوی کے کمرے میں جا کر ان کو واقعی بستر علالت پر پایا۔ لحاف الٹ کر دیکھا کہ اس نیک بخت نے رو رو کر اپنا برا حال کر رکھا ہے آنکھیں سوجی ہوئی ہیں، تکیہ آنسوؤں سے تر ہے ہم کو دیکھتے ہی انہوں نے اور بھی رقت سے رونا شروع کر دیا تو ہم نے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

"پاگل ہوئی ہو۔ آخر بات کیا ہے کچھ پتہ تو چلے"

اس کے جواب میں انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ہمارا ہاتھ لے کر ہچکیوں سے لبریز آواز میں ہم سے کہا "میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا آج میں آپ سے کچھ مانگتی ہوں اور اپنے مہر کے معاوضے میں مانگتی ہوں"

ہم نے کہا "میرے پاس جو کچھ ہے تمہارا ہے، بغیر مانگے تمہارا ہے"۔

انہوں نے بڑی عاجزی سے کہا "نہیں مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ انکار نہ کریں گے۔

ہم نے کہا "ہرگز انکار نہ کروں گا"

اُنھوں نے کہا "میں صرف آپ سے آپ کا ترنم مانگتی ہوں وہ کمبخت ترنم جس نے کل سے مجھ کو آدھ موا کر رکھا ہے آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آئندہ کبھی ترنم سے شعر نہ پڑھیں گے"

ہر چند کہ ہم کو اپنا ترنم جیسا عزیز ہے اور بغیر ترنم کے شعر بے روح ہو کر رہ جاتا ہے مگر اس وقت بیوی کی یہ عاجزانہ التجا تھی۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور گلوگیر آواز کے ساتھ وہ ہم سے ہمارا ترنم مانگ رہی تھی۔ لہٰذا ہم نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی ترنم سے شعر نہ پڑھوں گا"

بیوی نے اس وعدہ کو اور بھی مستحکم کرنے کے لیے کہا "یہ وعدہ آپ مجھ سے کر رہے ہیں، اور خدا کو حاضر ناظر جان کر کر رہے ہیں"

ہم نے کہا "ہاں صاحب، کہہ تو دیا اب ختم بھی کیجیے یہ قصہ۔

چنانچہ یہ قصہ تو خیر رفتہ رفتہ ختم ہو گیا مگر ہم نے پھر واقعی ترنم سے کبھی شعر نہیں پڑھا۔ مشاعروں میں اب بھی آوازیں بلند ہوتی ہیں "ذرا ترنم سے" مگر اب ہم کس کس کو سمجھاتے پھریں کہ ترنم بیوی نے مہر کے طور پر ہم سے لیا ہے۔

بلائے جان

یہ خودستائی نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ ہے کہ میں ایک نہایت ہی مہمان نواز خاندان کا فرد ہوں اور بزرگوں سے ہمیشہ یہی سنتا چلا آیا ہوں کہ مہمان ہمیشہ خوش نصیبوں ہی کے گھر آتے ہیں مگر ایک مرتبہ اس خوش نصیبی کا ایسا مزا چکھا ہے کہ اب مہمان کے نام سے روح فنا ہوتی ہے میری اور دم نکل جاتا ہے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع سن کر آپ کہیں گے کہ عجیب آدم بیزار انسان ہے یہ شخص بھی کہ مہمان جس کو رحمت کا فرشتہ کہنا چاہیے اُس سے یہ پناہ مانگتا ہے، مگر پہلے میری بپتا سُن لیجیے۔ اس کے بعد میرے متعلق کوئی رائے قائم کیجیے گا۔

صبح نہ جانے کس کا منہ دیکھ کر اُٹھا تھا کہ مجھ کو اپنے عزیز دوست احسن کا تار ملا کہ اُن کے سالے کسی کام کو لاہور آ رہے ہیں اور میرے مہمان ہوں گے۔ لہٰذا میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ مجھ کو مہمان نوازی کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اپنا اس خاندانی خصوصیت کے علاوہ میں مہمان کے آنے کو ذاتی طور پر اس لیے بھی پسند کرتا ہوں کہ مہمان کی تواضع میں جو تکلف برتا جاتا ہے۔ اُس میں کچھ کچھ

خود اپنی تواضع بھی ہو جاتی ہے۔ روزمرہ کے مقررہ کھانوں کے علاوہ کچھ دعوتی کھانے بھی نصیب ہو جاتے ہیں کچھ پھل مٹھائیاں اپنے حصے میں بھی آخر آ ہی جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے سرِ تار ملتے ہی مہمان عزیز کے لیے کمرہ صاف کرایا۔ ان کے آرام کی ہر چیز اُس کمرے میں مہیا کر دی اپنا سامان سمیٹ دیا تاکہ وہ اپنا سامان پھیلا سکیں، باورچی کو ہدایت کر دی کہ وہ ذرا پُر تکلف کھانے تیار کرے۔ ابھی میں اس انتظام سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دروازے پر مہمان کا تانگہ آ کر ٹھہرا۔ اور میں نے لپک کر ان کا خیر مقدم کرنا چاہا تو وہ خود ہی نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ غالباً آپ ہی شہاب صاحب ہیں۔ بھائی صاحب نے جو نقشہ بتلایا تھا ہو بہو وہی ہے بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر"

میں نے معذرت چاہی کہ آپ نے چونکہ پہنچنے کا صحیح وقت نہ لکھا تھا لہٰذا میں اسٹیشن پر نہ پہنچ سکا۔ تو نہایت خندہ پیشانی سے بولے "اس تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بھائی صاحب میں نہایت بے تکلف آدمی ہوں۔ آپ کے گھر کو اپنا سمجھ کر آیا ہوں۔ میں اپنے گھر میں کوئی اطلاع کر کے نہیں آتا۔ بھائی صاحب نے تو محض تعارفی نامہ دے دیا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت بھی نہ تھی"۔ وہ یہ کہہ کر ان حضرت نے سو روپے کا نوٹ نکال کر تانگے والے کو دیتے ہوئے کہا۔ باقی نناوے روپے مجھے دے دو۔

میں نے جلدی سے ایک روپیہ تانگے والے کو دے کر سو روپے کا نوٹ

ان حضرت کو واپس کر دیا اور سامان اُتروا کر اپنے کمرے میں لے آیا جس میں ان حضرت کو ٹھہرانا تھا۔ ان حضرت نے کمرے کا ایک سرسری جائزہ لے کر کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے مسہری ہے میز ہے کرسیاں اور غالباً یہ غسل خانے کا دروازہ ہے"۔ میں نے کہا "جی ہاں وہ غسل خانہ ہے۔ بہر حال یہ خانہ بے تکلف ہے"۔ وہ بڑی خوشی سے بولے "بالکل بالکل بے تکلف۔ جیسا بے تکلف میں تھا ویسا ہی میں آپ کو اور آپ کے گھر کو بے تکلف دیکھنا چاہتا ہوں، آپ کے ملازم کا کیا نام ہے؟"

میں نے کہا "غفور ہے اُس کا نام، آپ فرمائیے کیا کام ہے؟"

اور بجائے مجھ کو جواب دینے کے وہ غفور کو خود ہی پکار چکے تھے۔ غفور کو کہیں دور سے تو آنا تھا نہیں۔ وہ تو باہر ہی موجود تھا چنانچہ جیسے ہی وہ کمرے میں آیا ان حضرت نے اُس سے کہا "دیکھو بھئی کافی لاؤ بنا کر"۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے غفور تو ہکا بکا ہی رہ گیا۔ مگر خود کو بھی ہکلا کر عرض کرنا پڑا۔ "کافی تو میرا مطلب یہ ہے کہ کافی کا بھی بندوبست ہو جائے گا، مگر فی الحال چائے آ سکتی ہے"۔

وہ بڑی معقولیت سے بولے۔ "چائے! چائے کو میں کافی کا نعم البدل تو نہیں سمجھتا۔ مگر خیر اس وقت چائے سہی۔ مگر دیکھو بھئی غفور چائے اسٹرانگ ہو۔ اسٹرانگ سمجھتے ہو یعنی تیز۔ اور کافی آج ہی منگا لو۔ میں ٹھنڈی اور گرم دونوں قسم کی کافی کا عادی ہوں۔ بہر حال چائے میں ذرا جلدی کرو"۔ بندہ ابھی خوش ہو گیا کہ کس قدر

بے تکلف قسم کا مہمان ہے اس قسم کے مہمان کی خاطر تواضع میں خود اپنی ذمہ داری ذرا کم ہو جاتی ہے اور جتنا ہی مہمان اپنے کو کم سمجھتا ہے اتنا ہی میزبان اپنے کو سبکدوش محسوس کرتا ہے میں اپنے اس مہمان کی سادگی اور یگانگی پر خوش ہونے میں مصروف تھا اور یہ حضرت سوٹ کیس سے کپڑے نکال نکال کر کپڑوں کی الماری میں ٹانگ رہے تھے میں نے کہا۔ "اگر آپ کو زحمت ہو رہی ہو تو میں اپنے کپڑے اس الماری سے نکال لوں" وہ بڑی فراخدلی سے بولے "نہیں شہاب بھائی، زحمت کیسی، زحمت ہوتی تو میں پہلے ہی کہہ دیتا۔ میں نہایت بے تکلف قسم کا آدمی ہوں۔ کسی قسم کے تکلف کی تو مجھ سے امید رکھیئے ہی نہیں"۔

میں نے کہا۔ "غسل خانے میں نہانے کے لیے پانی بھی تیار ہے۔ اگر آپ چاہیں تو غسل بھی کر سکتے ہیں"۔

وہ بولے: "غسل میں کر کے چلا ہوں وٹینگ روم سے بس اس وقت اگر چائے پی کر آپ سے صرف گپ ہو گی، چائے میں نے اسٹیشن پر اس خیال سے نہیں پی کہ کافی آ کر یہاں پیوں گا"

میں نے ندامت سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ گھر میں کافی نہ تھی۔ مگر میں ابھی منگائے لیتا ہوں۔

غفور نے واقعی چائے لانے میں انتہائی جلدی سے کام لیا۔ اس میں اس کا کمال نہیں بلکہ میں پہلے ہی اہتمام کر چکا تھا کہ مہمان کے آتے ہی ذرا پرتکلف قسم

کی چائے مل جائے چنانچہ اُس نے میز پر چائے اور ناشتہ چُن لیا اور میں نے مہمانِ محترم سے عرض کیا۔

"چائے میں بنادوں یا آپ خود بنائیں گے اپنے مذاق کے مطابق؟"

وہ بولے۔ "میں خود ہی بناتا ہوں اور آپ کو بھی خود ہی بنا کر پلاؤں گا۔ مگر اس ناشتے کے علاوہ آپ کے یہاں کچھ بادام تو نہیں ہوں گے؟"

میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

"بادام سے آپ کی مراد محض بادام سے ہے یا"

وہ بات کاٹ کر بولے۔

جی ہاں صرف بادام بات یہ ہے کہ میں کافی میں تو دودھ یا کریم کا قائل ہوں اگر مجبوراً چائے پینی پڑے تو اُس میں دودھ کی جگہ شیرۂ مغزِ بادام آمیز کرتا ہوں

دیکھو بھئی غفور بادام تو نہیں ہیں گھر میں"؟

اور غفور اتنا بدتمیز کہ اُس نے ٹکا سا جواب دے دیا "شب برات میں آئے تھے اب تو کاہے کو ہوں گے"

کاذب نہ ہونے سے جو ندامت تھی وہی کیا کم تھی کہ اب باداموں کے سلسلے کی نااہلی پر اور بھی گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مگر میں نے بھی بے حیائی لاد کر کہا "بادام کا بندوبست ہو جائے گا۔ اس وقت تو آپ دودھ ہی پر قناعت کریں" ان حضرت نے مجبوراً چائے کی پیالی بنا کر پہلے مجھ کو دی پھر اپنے لیے بنا کر آملیٹ کاٹنے میں [illegible]

کو کھاتے ہی عجیب سا منہ بنا کر کہا۔

"کیا آپ کے یہاں بناسپتی گھی استعمال ہوتا ہے؟"

میں نے حیرت سے کہا۔ "جی نہیں تو۔ کیوں کیا آملیٹ میں آپ کو بناسپتی گھی کا شبہ ہوا ہے؟"

اور مجھے جواب دینے کی جگہ ان حضرت نے غفور سے کہا۔ "میرے لیے گھی میں تلوا دیا کرو آملیٹ وغیرہ۔ یہ گھی تو دو کوڑی کا بھی نہیں۔"

غفور نے مجھ کو دیکھ کر کہا۔ "سرکار یہ تو خالص گھی ہے دیہات سے آیا ہوا۔"

میں نے غفور کو ڈانٹا۔

"تم سے کہہ دیا کہ گھی میں تلوا دیا کرو۔ بس بات ختم ہو گئی۔"

اور اس عرصے میں مہمانِ محترم چائے کا گھونٹ لے کر ایسا منہ بنائے بیٹھے تھے جیسے چوہا کھایا ہو۔ مجھ کو اپنی طرف دیکھتا ہوا دیکھ کر بولے۔

"یہ تو چائے کی ارذل ترین قسم معلوم ہوتی ہے۔ غالباً مری ہے جو سٹیشنوں پر آبخوروں میں ملتی ہے۔ بڑی گھٹیا چائے ہے۔"

اور یہ کہہ کر اس حقارت سے چائے کی پیالی آگے کھسکائی کہ میں شرم سے پانی پانی ہو کر رہ گیا۔ بہر حال اسی طرح ایک ایک چیز پر اعتراض کر کے ان حضرت نے ناشتہ ختم کیا۔ اور جب میں نے اجازت چاہی کہ مجھے دفتر جانا ہے تو وہ بولے۔

"جی ہاں آپ ضرور تشریف لے جائیں۔ مجھے خود بھی باہر جانا ہے کچھ کام سے

پر مجھ ملاقات ہو گی نا۔"

میں نے کہا — "جی ہاں میں دفتر سے کھانے کے وقت تک واپس آجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں گھر میں چلا گیا۔ تاکہ دفتر جانے کی تیاری کروں۔ اور جب تیار ہو کر پھر باہر آیا ہوں کہ کپڑے پہن کر دفتر روانہ ہو جاؤں تو وہ حضرت باہر جا چکے تھے۔ میں نے کپڑوں کی الماری کھول کر اپنا سوٹ نکالنا چاہا تو وہ غائب تھا۔ بار بار دیکھا مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ خیال آیا کہ شاید ان حضرت نے الماری سے نکال کر کہیں اور پھینک دیا ہو۔ مگر وہ اس کمرے کے علاوہ غسل خانے کی کھونٹیوں تک پر نہ تھا۔ آخر غفور کو بلا کر پوچھا کہ میرا سرمئی سوٹ کہاں ہے؟ تو اس نے کہا —

"جی سرمئی سوٹ تو شاید مہمان صاحب پہن کر گئے ہیں۔"

میں نے بڑی پریشانی سے کہا

"مگر اس میں تو میری کنجیاں اور اندر کی جیب میں میرا پڑھنے کا چشمہ بھی تھا"

غفور نے نہایت اطمینان سے کہا

"تو ہو گا اسی جیب میں۔ مجھے کیا معلوم۔ میں سمجھا تھا کہ وہ انہیں کے کپڑے ہیں۔ جبھی تو البتہ آپ کا پہن گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

جہنم میں گیا چشمہ۔ مگر بغیر کنجیوں کے میں دفتر کیسے جاؤں؟ اور بغیر عینک کے وہاں خاک کام کر سکتا ہوں؟

غصے سے گردن ہلا کر کہا۔

"یہ تو ہے، پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟"

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

لاحول ولا قوۃ۔ اب میں رخصت کی درخواست لکھتا ہوں تم جا کر دفتر دے آؤ۔ مگر لکھوں کیسے بغیر عینک کے۔ اور قلم بھی کوٹ ہی میں ہے۔ جاؤ اندر سے قلمدان لاؤ۔"

اور رخصت کی درخواست ٹٹول ٹٹول کر لکھنے کے بعد جب میں نے دفتر بھیج دی تو پہلی مرتبہ مجھ کو اس بے تکلف مہمان کی بے تکلفی سے ڈر سا لگا کہ یہ تو پہلے ہی دن کی بے تکلفی ہے نہ جانے آگے کیا ہو۔ آج کی دفتر کی حاضری بوجوہ نہایت ضروری تھی۔ مگر بغیر کپڑوں کے جانا بیکار تھا۔ اور بغیر عینک کے اور بھی بے کار۔

بہرحال میرا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ میں اپنے عزیز مہمان سے ان کی شکایت کروں کہ ان حضرت نے واپس آ کر مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔

"صاحب کمال ہے کہ آپ یہ سوٹ پہنتے ہیں۔ یہ آپ نے جلدی میں درزی کی جگہ کسی موچی سے تو نہیں سلوا لیا تھا۔ بہت ہی بیہودہ سلا ہوا ہے۔ میرے کپڑوں پر استری نہ تھی اس لیے میں یہ پہن گیا تھا۔ مگر جہاں جہاں گیا، لوگ مجھ پر ہنسے۔"

اب میں ان سے کیا کہتا کہ میرے درزی نے میرے ناپ کا سیا ہے۔ اس کو کیا خبر تھی کہ میرے مہمان بھی اس کو پہنیں گے۔ لہٰذا ان کی رعایت بھی اسی میں رکھے

مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود باورچی کے ہاتھ کے سلے ہوئے کپڑوں کے ان حضرت نے میرا ایک کپڑا نہ چھوڑا۔ باری باری سب ہی پہنتے ہیں۔ کیا سوٹ، کیا شیروانی حتیٰ کہ کرتے اور پاجامے تک نہ چھوڑے۔

خیر کپڑوں کو جانے دیجئے۔ پہن لیے تو پہن ہی لئے۔ غفور کو اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر تیسرے ہی دن اس جرم پر نکال دیا کہ اُس نے ناشتے میں انڈا جو پیش کیا وہ پورا اُبل چکا تھا۔ دوسرا نصف اُبلا ہوا تھا تیسرا ایک چوتھائی کچا تھا اور وہ چاہتے تھے ایک چوتھائی اُبلا ہوا۔ پھر باورچی کو اس جرم پر سخت سست کہا کہ اُس نے کوفتوں میں سبز مرچ بھر دی تھی۔ اور اُس کو کافی بنانا نہ آتی تھی۔

مختصر یہ کہ جس دن اُن حضرت کی واپسی ہوئی ہے میں نے باورچی سے بھی دست بستہ معافی مانگی۔ اور غفور کو بھی ناک سے لکیریں کھینچ کر واپس لایا۔ اور اب جب کبھی مہمان کا نام آجاتا ہے، میرا خون خشک ہو جاتا ہے۔ حالانکہ میں اُس خاندان کا ایک فرد ہوں جو مہمان نوازی کے لیے مشہور ہے اور مہمان کو رحمت کا فرشتہ سمجھتا ہے۔

ناصح مشفق

رات بھر غائب رہنے کے بعد جب جاندار سا گھڑا لیے علی الصباح گھر پہنچے آج بھی حسبِ معمول وہ فجر کی نماز پڑھ کر وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ پاکر مُنہ پھیر کر کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر وظیفہ پڑھتے ہی میں بہ آیت قرأت سے لاحول ولا قوۃ

اور ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شیروانی ایک طرف اچھال دی موزے اُتار کر جوتے میں ٹھونس دیئے اور بستر پر لیٹ کر اب جو آنکھ بند کی ہے آزمائش کے بادل پھٹے ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔ ہم حساب لگانے میں مصروف ہیں کہ آج جو ساٹھ روپے ہارے ہیں اُس میں ہمارا ذاتی قصور کتنا تھا اور تقدیر نے کس حد تک بے وفائی کی ہے سچ

تو یہ ہے کہ قیامت کا پتہ آیا ساری رات گو کمبخت بھر تپ ڈتا ہوا اور اڑ کر چڑھتا آ رہا

. . . .

. . . .

آخری ہاتھ میں بلف نہ چلتے تو بارہ چودہ روپے سے زیادہ نہ ہوتی گو خسارا پورا کرنے کے جوش میں بعض چڑیا کے غلام بیش پر وہ جوش آیا ہے کہ ساٹھ روپے اگل دینا پڑے حساب ابھی اس حد تک پہنچا تھا کہ نیند آ گئی اور نہ جانے کتنی دیر سوئے ہوں گے کہ ایک نہایت گرجدار اور خوفناک آواز سے آنکھ کھل گئی. غور سے سنا تو برابر کے کمرے سے پھر وہی آواز گرج کر کانوں میں آئی۔

استغفر اللہ

پھر معلوم ہوا جیسے کسی نے آہستہ سے کچھ سرگوشی کی اور اس کے جواب میں پھر وہی ورزشی آواز

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ"

اب ہم سے نہ رہا گیا اور چپکے سے اٹھ کر دروازے کے شیشے سے جو جھانکا تو عجیب منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک نہایت "بھگت" بہت ہی نہایت "بزرگ" عجیب معلوم ہوتی داڑھی لیے اپنے چہرے پر عبرت اور تنفر کی ملی جلی کیفیات طاری کیے بیٹھے جھوم رہے ہیں اور بیگم صاحبہ ان کے سامنے اس طرح بیٹھی ہیں گویا ..

اک تماشہ کا پتہ ہے کف شعبدہ گر میں

ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ کافی رو چکی ہیں۔ آنکھیں چندھی ہو چکی تھیں اور ناک سُرخ۔ آخر ایک مرتبہ اپنے دوپٹے سے آنکھیں رگڑ کر بولیں۔

خالو جان! بڑی بڑی قرض میں بندھ چکی ہے گھر کی جو حالت ہے وہ آپ خود دیکھ لیجئے۔ کام کاج میں ان کا جی ہی نہیں لگتا اور لگے کیسے رات رات بھر کی جگائی۔ مجھ کو تو صحت ہی کے لالے پڑے ہوتے ہیں۔ اس موئے چرنے کے بدولت۔

وہ حضرت داڑھی پر ہاتھ رکھ کر پھر جو سیاہ اور سرخ رنگ کے شربت کا پورا گلاس ایک گھونٹ میں پار کرنے کے بعد بولے "جزاک اللہ"

اور پھر خاص دل سے وہ تین گھوریاں گشت کھا کر بولے۔ انشاء اللہ میں کچھ برخوردار کو سمجھاؤں گا اور اس پاک پروردگار کی ذات سے اُمید ہے کہ میرے سمجھانے کا اس عزیز پر حسب دلخواہ اثر ہوگا۔ بہرحال تم ان کو جگا دو۔ مگر جگانے سے پہلے خود اپنے منہ پر چھینٹا ڈال لو تاکہ ان کو یہ اندازہ نہ ہو کہ تم گریاروتی رہو۔ نہایت خندہ پیشانی سے ان کو جگاؤ اور میرے پاس بھیج دو وہ بڑا مقلب القلوب ہے کیا عجب کہ صاحبزادے راہِ راست پر آجائیں بہرحال تم منہ دھو ڈالو اور پھر ان کو جگا دو"

ہم یہ سنتے ہی دروازے سے ہٹ کر پھر اپنے بستر پر آگئے اور تھوڑی ہی دیر میں بیگم صاحبہ نے آکر حسب ہدایت نہایت خندہ پیشانی سے جگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا سنتے ہیں آپ۔ خالو جان ہیں"

سوتے کو تو جگایا جا سکتا ہے۔ مگر جاگنے والے کو کون جگائے ہم نے گویا نیند

رہی ہیں کروٹ بدلی تو وہ بھی دوسری طرف آکر پھر بولیں۔

" توبہ ہے ایسی بھی کیا نیند۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ اُٹھیے تو سہی خالو جان آئے ہیں"۔

اب ہم نے ایک انگڑائی لے کر آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "خالو جان کون؟"

وہ بولیں۔ "خالو عبدالقیوم آئے ہیں ملتان سے"

زیارت تو کر ہی چکے تھے نام اور پتہ سن کر ہوش ہی تو اُڑ گئے۔ ان حضرت کے زہد و اتقا کے کافی افسانے سن چکے تھے کہ سخت پرہیزگار قسم کے شدت پسند مولوی ہیں جو اپنی ایک بیوی سے ناراض ہو کر دوسری بیوی کو بھی محض اس لیے سزا دیتے ہیں کہ مساوات قائم رہے اور اگر دونوں بیویوں میں لڑائی ہو جائے تو دونوں کے مزاج درست کرنے کے لیے تیسری شادی کے انتظامات شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ دونوں بیویاں آپس میں گلے مل کر ان کے قدموں پر گر پڑتی ہیں۔ بہرحال ان کا نام سنتے ہی ہم گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی تیار ہو کر اب جو اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ زیر لب کچھ پڑھنے میں مصروف تھے ہم کو دیکھتے ہی بڑی گرمجوشی کے ساتھ مگر بیٹھے بیٹھے انداز سے بولے۔ "آؤ برخوردار۔ صاحبزادی سے یہ سن کر کہ تم آرام کر رہے ہو مجھے تشویش تھی کہ مزاج تو بخیر ہے؟"

ہم نے ادب سے عرض کیا۔ "الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں یوں ہی ذرا نیند آگئی تھی"۔

ان حضرت نے غور سے دیکھ کر فرمایا۔ "مگر تمہاری آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند ابھی پوری نہیں ہوئی غالباً رات جاگنا پڑا ہے کسی وجہ سے۔"

عرض کیا "درست فرمایا آپ نے رات ایک دوست کے یہاں کچھ تقریب تھی چنانچہ ساری رات نہیں سو سکا۔"

وہ حضرت ریش مبارک پر دست شفقت پھیر کر بولے "گویا میرا اندازہ درست تھا مگر میرا اندازہ اب بھی یہ ہے کہ تمہاری آنکھوں میں صرف ایک رات کی نیند نہیں بلکہ مسلسل بیداری کی کیفیت ہے۔"

ہم نے ٹالنے کے لیے کہا "جی ہاں یہ بھی درست ہے میں ذرا کم ہی سوتا ہوں۔"

ان حضرت نے اب ذرا تفصیل شروع کر دی: "مگر یہ بیداری تو صحت کے لیے بہت بری ہے اس طرح تو صحت بہت جلد جواب دے جائے گی اور اگر صحت جواب دے گی تو فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی تو بہت سے قصے کوتاہ ہو جائیں گے۔ ہم نے اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھتے ہوئے بیگم صاحبہ سے کہا "خالو جان کے لیے چائے تو منگائیے" غالباً خالو جان خود بھی یہی چاہتے تھے۔ حالانکہ ابھی شربت کا پورا جگ ڈکار چکے تھے مگر یہ سن کر چونکہ ان کو کوئی اعتراض نہ ہوا لہٰذا بیگم صاحبہ کو چائے کے انتظام کے لیے اٹھنا پڑا۔

اور ان کے جانے کے بعد ان حضرت نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"برخوردار یہ نہ سمجھنا کہ مجھ سے کسی نے تمہاری شکایت کی ہے۔ مگر یہ بات

میرے علم میں آچکی ہے کہ تم کو کچھ تاش وغیرہ کھیلنے کا شوق ہے۔"

ہم نے کہا۔ "جی ہاں میں جھوٹ بول کر ایک جرم کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔"

وہ خوش ہو کر بولے۔ "جزاک اللہ۔ مجھ کو تم سے اسی جواب کی اُمید تھی اعتراف بجائے خود ایک ایسا وصف ہے کہ ضمیر کی زندگی کا پتہ دیتا ہے۔ بہت خوش ہوا تمہاری اس اخلاقی جرأت پر۔ برخوردار میں بڑا روشن خیال آدمی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ آج کل کی سوسائٹی میں تاش کو کتنا دخل ہے بڑے اور چھوٹے سب ہی کھیلتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر کوئی چھوٹا تاش کھیلے تو اس کو جوا کہا جاتا ہے۔ پولیس کے چھاپے پڑتے ہیں قمار بازی کے قوانین حرکت میں آجاتے ہیں اور اگر بڑے آدمی کلب میں یہی جوا کھیلیں تو اسکو محض تفریح کہا جاتا ہے تو غالباً تم کلب میں کھیلتے ہو گے مگر کلب ہی کھیلتے ہو تو ظاہر ہے کہ یہ جوا نہیں ہے۔"

ہم نے عرض کیا۔ "جی نہیں خیر کلب میں تو نہیں کھیلتا مگر جن حضرات کے ساتھ کھیلتا ہوں وہ سب شریف زادے اور معزز خاندان کے افراد ہیں۔"

اُن حضرت نے بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا۔ "تمہاری صاف گوئی سے بڑی مسرت ہوئی۔ عزیز من تم کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں اس کو بھی اتنا بڑا عیب نہیں سمجھتا جتنا عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ انسان اعتدال کا قائل رہے اور پیر اتنے ہی پھیلائے جتنی چادر ہو۔ بہرحال چونکہ تم سچ بولتے ہو لہٰذا میں تمہاری طرف سے مایوس نہیں ہوں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ ایسا انسان حقوق و فرائض سے باوجود تاش کھیلنے کے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔

لیکن اسی وقت بیگم صاحبہ نے معہ چائے کی کشتی کے داخل ہو کر ان حضرت کو پھر انتہائی سنجیدہ بنا دیا۔ مگر جب وہ چائے بنانے بیٹھ گئیں تو ان حضرت نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"صاحبزادی تمہارے شوہر سے مل کر مجھے بخدا بڑی مسرت ہوئی اور میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں تم نے ایسا صاف گو اور سچا شوہر پایا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "جی ہاں جو نہ صاف گوئی اور سچائی سے کام لے کر نت نئے بہانوں سے تاشوں کے لیے مجھ سے روپیہ اینٹھتے ہیں مثلاً رات ہی انکم ٹیکس کی ایک قسط ادا کرنے کے لیے روپیہ لے گئے اور رات بھر انکم ٹیکس ادا کرتے رہے۔"

ان حضرت نے ہنس کر کہا "تم ابھی بچہ ہو۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ تمہاری خاطر ان کو اس حد تک عزیز ہے کہ یہ تم سے بہانہ کرتے ہیں اور محض تمہاری دل آزاری کے خوف سے باوجود انتہائی صاف گو ہونے کے دروغ مصلحت آمیز سے کام لے جاتے ہیں۔ بہرحال اب تم مطمئن رہو میں اُن کا ذمہ دار ہوں۔"

بیگم صاحبہ نے غور سے ہماری طرف دیکھا گر ہم خود حیران تھے کہ ان حضرت نے جو ذمہ داری قبول کی ہے وہ کیا ہے۔ اس لیے کہ ہم کو تو آج بھی کل کا خسارہ پورا کرنے کے لیے جانا تھا اور انکم ٹیکس کی قسط ادا کرنے کے لیے جو روپیہ لیا تھا اس کا بقیہ ایک سو چالیس اسی کارِ خیر کے لیے رکھ چھوڑا تھا البتہ فکر تھی تو صرف

یہ کہ اب ان حضرت سے کیسے نجات حاصل کریں گے کہ ان حضرت نے چائے کی پیالی
پر [illegible] انڈھاتے ہوئے کہا۔

اچھا بھئی نواب مجھ کو اجازت دو میں ایک خاص کام سے اسی وقت قصور جا رہا ہوں رات غالباً دیر سے واپسی ہو گی اور عزیز من تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

ہم نے گڑبڑا کر کہا "جی وہ۔ یعنی میں ضرور چلتا مگر —"

وہ بات کاٹ کر بولے "اگر مگر کچھ نہیں تمہارا میرے ساتھ ہونا بیحد ضروری ہے صرف شیروانی پہن لو۔"

بیگم صاحبہ نے بھی تائید کی۔ "آخر آپ جاتے کیوں نہیں خالو جان کے ساتھ"

اور ہم کو "شلے بر اندیش" کے مصداق ان حضرت کے ساتھ گھر سے نکلنا ہی پڑا۔ خیال تھا کہ آج شاید کل کا نقشہ پورا ہو جائے گا قسمت میں جیت نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ ہم دونوں ابھی گھر کے باہر نکلے ہی تھے کہ ان حضرت نے کہا۔

"کھیل کون سا ہوتا ہے فلش نا؟"

عرض کیا۔ "جی ہاں فلاش ہی کھیلتے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "بہت بڑا کھیل تو نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دو ڈھائی سو روپے سے کام چل جائے گا۔"

ہم نے چونکتے ہوئے کہا۔ "جی۔ یعنی؟"

وہ ہنس کر بولے "بھئی مطلب یہ ہے کہ ذرا ہم بھی دیکھیں کہ تم لوگ کتنے پانی

ہیں ہو۔ کل کا دن ذرا ایسا نحس تھا کہ چلتے چلاتے تم ان سے باون روپے ہار کر چلے تھے۔ آج دیکھیں تمہارے احباب کس حد تک گلا کاٹتے ہیں۔"

ہم کو اپنی سماعت پر اعتبار نہ آتا تھا اور وہ برابر کہہ رہے تھے۔

"بات یہ ہے کہ یہ کھیل تو دل کا ہے، ہار جیت تو خیر لگی ہی رہتی ہے مگر پتے کر اتنے پیسے ضرور دینا چاہیں جو اس کی قیمت ہو اور بلف ہو تو ایسا کہ خود بیوقوف نہ بننا پڑے۔"

ہم نے بمشکل تمام اپنی حیرت پر غالب آ کر کہا۔ "مگر معاف کیجئے گا میں آپ کے ساتھ نہ کھیل سکوں گا آپ بہر حال بزرگ ہیں۔"

وہ بولے۔ "یہ غلط ہے خوردگی اور بزرگی تاش کی پھڑ میں نہیں ہوتی۔ صاحبزادے میرے لیے یہ مسرت کیا کچھ کم ہے کہ تم اپنے ذوق کے آدمی مجھ کو مل گئے۔"

اور واقعی جب تاش شروع ہوا تو یہ مقدس بزرگ نہایت کہنہ مشق جواری ثابت ہوئے کیا مجال کہ ان کا بلف پکڑا جائے اور کیا مجال کہ کوئی اور بلف چل جائے اور یہ اس کو چل جانے دیں۔ اُس رات وہ ایک سو دس جیتے اور ہم نے اپنا کل کا خسارہ پورا کرنے کے علاوہ چالیس اور بنا لیے۔ اب یہ حضرت مستقلاً ہمارے یہاں موجود ہیں راتیں اسی طرح آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں مگر صبح جب واپس آتے ہیں تو وظیفہ کے ساتھ لاحول نہیں سنتے۔ سچ کہا تھا ان حضرت نے کہ اگر چھوٹا آدمی کھیلے تو جوا ہے اور بڑے آدمی کھیلیں تو تفریح ہے۔ چنانچہ وہی فلاش جو پہلے

تھا اب بیگم صاحبہ اسی کو ہماری سعادت مندی سمجھتی ہیں کہ ہم ان کے خالو جان کے ساتھ روز قصور جاتے ہیں اور پھر بھی قصوروار نہیں بنتے۔

سالگرہ

مجھے ذاتی طور پر سالگرہ سے شدید اختلاف ہے۔ خواہ وہ اپنی سالگرہ ہو یا کسی
اور کی۔ اپنی سالگرہ سے اس لیے گھبراتا ہوں کہ مجھ کو یہ معلوم کرنے کا کبھی شوق
نہیں ہوا کہ زندگی کتنی ختم ہو چکی اور کتنی باقی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے نزدیک
جینے کا مزہ کچھ علی الحساب جینے ہی میں ہے۔ یہ نہیں کہ ہر سال بیٹھے حساب لگا رہے
ہیں کہ لیجئے زندگی کا ایک سال اور کم ہوا اور موت ایک سال اور قریب آ گئی۔
رہ گئی دوسروں کی سالگرہ۔ اُس کا میں اس لیے مخالف ہوں کہ نام تو ہوتا ہے پارٹی
میں جانے کا اور دینا پڑتا ہے وہاں تحفہ۔ پھر تحفے کے سلسلے میں بھی خیال یہ رکھنا پڑتا
ہے کہ اپنا تحفہ ایسا حقیر نہ ہو کہ دوسروں کے تحفے دیکھ کر خودکشی کر لی جائے۔ ممکن ہے
اور کسی کو یہ اتفاق پیش نہ آیا ہو مگر میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ یہ صورت بھی
پیش آ سکتی ہے بلکہ مجھ کو تو پیش آ ہی گئی تھی وہ تو کہیے کہ میں نے خودکشی کر خود ہی ٹال

لیا۔ ورنہ بہت سے شاعر دوستوں کو سنہ ۱۹۵۱ء نکالنے کے لیے نہ جانے کس طرح تاریخ وفات کہنا پڑتی۔

ہوا یہ کہ ایک عزیز کے بچے کی سالگرہ تھی اور میں اُس میں شرکت کے لیے تحفہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا کہ ایک اور دوست مل گئے۔ جو حال ہی میں ولایت سے واپس آئے تھے اور اب جو میں نے اُن سے تحفے کے انتخاب میں مدد چاہی تو وہ بڑے تجربہ کارانہ انداز میں بولے کہ بھئی تم لوگوں نے بھی اس تحفے کے قصے کو اچھی خاصی مصیبت بنا لیا ہے میں نے تو اپنے قیام انگلستان میں ہمیشہ یہی دیکھا کہ اس سلسلے میں قطعاً تکلف نہیں برتا جاتا برائے نام سی کوئی چیز خریدی اور دے دی۔ تحفہ قیمت کے اعتبار سے جانچنا ایک گنوار پن ہے۔ مقصد تو اظہار خلوص سے ہے چنانچہ وہاں تو بڑے بڑے لوگ یہ کرتے ہیں کہ جوتے کی ڈوری تک تحفے میں دے دیتے ہیں، خود میں نے ایک بہت بڑے لارڈ کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے لارڈ کے بچے کی سالگرہ میں صابن کی ایک ٹکیہ دے گیا تھا۔ اور اُس پر لکھ دیا تھا کہ برخوردار اس سے بُلبلے بنانا، میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"واہ وا، یہ تو اُس عالی دماغ لارڈ نے گویا شعر کہہ دیا۔ اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لاکھ سالگرہ مناؤ مگر ؎

آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا۔"

چنانچہ فی الحال میں نے بھی صابن کی ایک ٹکیہ خرید کر اُس پر یہی عبارت

لکھ دی کہ

"برخوردار اس سے بُلبُلے بنانا"

مگر اب جب میں پارٹی میں پہنچا ہوں تو تحفوں کی میز عین وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ اور اس پر عجیب عجیب تحفے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ کیمرہ، چھوٹا سا ریڈیو سیٹ، تین پہیوں کی سائیکل، چابی کا کھلونا موٹر، کرکٹ کا پورا سیٹ، اور تو اور سب سے زیادہ دھوم جس تحفے کی تھی وہ تھا ایک بے بی کار جس پر وہ برخوردار بیٹھے نہایت شوق سے سارے ہال میں "پوں پوں" کرتے پھر رہے تھے۔ واقعی یہ بڑی خوبصورت بے بی کار تھی اور یقیناً سو ڈیڑھ کی ہوگی۔ مگر جب یہ معلوم ہوا یہ تحفہ خود میرے ہی ایک ماتحت ورماتحت نے تو اپنی صابن کی ڈبیا پر مارے ندامت کے میرا برا حال تھا۔ اور تمام بُلبُلے خود میرے دل و دماغ میں بن بن کر پھوٹ رہے تھے۔ اس ندامت کے ساتھ ہی ساتھ میں حساب لگا رہا تھا کہ ان تمام تحفوں کی مجموعی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ اور میرا تخمینہ یہ تھا کہ کم از کم یہ ہزار بارہ سو روپے کے تحفے ہیں جن میں میری ساڑھے سات آنے کی صابن کی ٹکیہ بھی شامل تھی۔ جو ان تحفوں میں سب سے بیہودہ تحفہ تھا۔

ندامت کو تو جیسے تیسے، گھڑوں پانی پڑ کر رہ گیا اور جی چاہا کہ اپنے اُن دوست کے گھر جا کر وہ صابن کی ٹکیہ آج ہی ان کے منہ پر مار آؤں جن کے مشورے پر یہ گستاخی حرکت میں کر گزرا تھا۔ کسی سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہ تھا۔ اور سب سے زیادہ

شرمندہ اپنے اُس ماتحت سے تھا جس نے یہ قیمتی بے بی کارڈ سے کرا اپنے جشن سے گاڑھ دیئے تھے اس پارٹی میں۔ مگر اس پارٹی کے بعد میں اس تقریب کی تجارتی صورت پر اس سنجیدگی سے غور کرتا ہوا گھر تک پہنچا کر گھر پہنچنے کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ بیوی کو بلا کر اُن سے پوچھا کہ ـــــ

" آپ کو کچھ یاد ہے آپ کس تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں ؟"

وہ حیرت سے بولیں ـــــ

" خیریت تو ہے۔ میری تاریخ پیدائش کی آج کیا ضرورت پیش آگئی۔ کوئی جادو ٹونا کروانا ہے مجھ پر ؟"

میں اس قسم کے غیر سنجیدہ جواب کے لیے اُس وقت تیار نہ تھا۔ لہٰذا پوری سنجیدگی سے کہا ـــــ

" بھئی کچھ ایسی ہی ضرورت ہے۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں ۔"

وہ بدستور اس کو معمولی بات سمجھ کر بولیں ـــــ " تو بھلا مجھے کیا معلوم کہ میں کس تاریخ کو پیدا ہوئی ہوں۔ کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا ـــــ

" لاحول ولا قوۃ۔ یہ بات غور کرنے سے طے نہیں پاتی۔ بلکہ طے شدہ ہوتی ہے۔ بہرحال آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کس تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں ۔"

وہ سادگی سے بولیں ـــــ " ہاں مجھے تو پتہ نہیں ۔"

میں نے کہا ـــ "اچھا تو آپ ۲۴ مارچ کو پیدا ہوئی تھیں"

وہ حیرت سے بولیں ـــ "۲۴ مارچ کو! یہ آپ کو کیسے معلوم؟"

میں نے کہا ـــ "بس کہہ جو دیا کہ آپ ۲۴ مارچ کو پیدا ہوئی تھیں۔ آج ۱۹ فروری ہے اور پانچ دن کے بعد آپ کی سالگرہ ہے"۔

وہ ایک دم چونک کر بولیں ـــ "میری سالگرہ؟ لو اور سنو۔ بڈھے منہ مہاسے وگ چلے تماشے۔ یہ آخر سوجھی کیا ہے؟"

میں نے کہا "سوجھی نہیں ہے بلکہ یہ طے ہے میں آج ہی کارڈ چھپواتا ہوں اور آپ پارٹی کے انتظامات کیجئے۔ میں سب کو بلاؤں گا کسی کو نہ چھوڑوں گا تاک میں دم کر رکھا ہے ان سب نے سالگرہ کی پارٹیاں کر کر کے۔ ایک ایک سے بدلہ لوں گا۔ بہت بن چکا بیوقوف۔ اور بہت دے چکا تحفے۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے میں نے تحفے دیئے ہیں تو وصول کیوں نہ کروں"۔

بیوی نے حیرت سے مجھ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "مگر بیٹھے بٹھائے یہ خیال کیسے آ گیا"۔

میں نے کہا ـــ "ہزار بارہ سو روپے سے کم کے تحفے نہ تھے جو سراج کے لڑکے کی سالگرہ میں سب نے دیئے ہیں۔ وہ چاہے تو نوکری چھوڑ کر کھلونوں کی دوکان کھول سکتا ہے۔ چھپا کر لگ بھگ کر گئی ہی لونڈے کو اگر ہزار بارہ سو روپے کے تحفے مل سکتے ہیں تو آپ کو کیوں نہ ملیں گے تحفے۔ لہٰذا میں نے دو ڈھائی روپے سے زیادہ کی

پارٹی پر صرف نہ کیا ہوگا اور تحفے بٹور لیے ہزاروں کے"۔

بیوی نے وہی عورتوں کی سی بات کہی ۔ "اچھا خیر آپ میرا تماشا تو بنائیے نہیں۔ ایسا ہی تحفے بٹورنے کا شوق ہے تو اپنی سالگرہ کر لیجیے"۔

مگر میں طے کر چکا تھا اور میرا ارادہ اٹل تھا۔ لہٰذا میں نے بیوی کو کوئی جواب نہ دیا۔ لکھنے کی میز پر بیٹھ کر دعوت نامے کا مضمون لکھا اور سیدھا پریس جا کر کارڈ چھپنے کو دے آیا۔ ذہن میں فہرست تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ مگر لفافے لکھتے وقت بیوی کو بھی مشورے میں شریک کر لیا۔

"یہ سب لفافے دیکھ کر بتائیے کہ کوئی نام رہا تو نہیں۔ ہاں ٹھیک ہے رضوی کا نام رہ گیا تھا۔ وہ ضرور بنارسی ساری دے گا"۔

بیوی نے کہا۔

"یہ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ سچ مچ لوگ مذاق اڑائیں گے"۔

میں نے لفافے لکھتے ہوئے کہا ــــ

یعنی ہم سنجیدگی سے تحفے دیتے پھریں اور ہم سالگرہ منائیں تو لوگ مذاق اڑائیں چہ خوش۔ درّانی کا نام رہ گیا تھا۔ حالانکہ وہ کلائی کی گھڑی دے گا اور کیا عجب کہ سونے کی گھڑی دے"۔

بیوی نے منہ بنا کر کہا ــــ "دی نہ ہو اس نے گھڑی۔ ڈیڑھ دو سو روپے پارٹی میں لگ جائیں گے اور بیوقوف الگ بننا پڑے گا"

میں نے کہا ـــــ

"مجال ہے جو کوئی بیوقوف بنا جائے جتنے تحفے دیئے ہیں سب اگلوا کر چھوڑونگا درانی کی بچی کی سالگرہ میں اُونی سوٹ دیا تھا میں نے چالیس روپے کا۔

بیوی نے کہا "لوگ یہ نہ کہیں گے کہ اب تک تو کبھی سالگرہ ہوتی نہیں۔ یہ ایک دم کیسے پیدا ہو گئیں۔ اپنی پینتیسویں سالگرہ منانے"

میں نے کہا ـــــ "کہہ دینگے ہر سال مناتے تھے سالگرہ، اب کی ذرا شاندار طریقے پر منائی ہے دوسری بات یہ ہے کہ کارڈ میں آپ کی عمر پینتیس برس نہیں بلکہ بتیس لکھی گئی ہے جو بھی یاد رکھنے کی بات ہے اس لیے کہ اب بہر حال یہ تقریب منائی جائے گی"

کارڈ تقسیم کر دیئے۔ پارٹی کے انتظامات مکمل ہو گئے اور اپنے نزدیک کوئی ایسا عزیز یا دوست نہیں چھوڑا جو تحفے کے سلسلے میں مقروض نہ ہو۔ سب ہی کو دعوت دی گئی اور ہم مارچ کو گھر دلہن کی طرح سجا دیا گیا۔ ایک نہایت شاندار کیک بھی بنوا لیا۔ جس پر چھوٹی چھوٹی بتیس شمعیں لگی ہوئی تھیں۔ پارٹی کا جو بجٹ بنایا تھا اس سے بڑھ کر رقم خرچ کرنا پڑی۔ اس لیے کہ شاندار تحفے وصول کرنے کو پارٹی بھی شاندار ہی ہونا چاہیئے۔

جہاں مہمانوں کی نشست کا اہتمام تھا ہال وسط میں ایک بڑی سی میز تحفوں کے لیے رکھ دی اور اس پر سب سے پہلا تحفہ خود اپنا سجا دیا۔ یہ ایک نیکلس تھا جو دراصل بیوی کو جہیز میں ملا تھا۔ صرف اس کا خوبصورت ساچہ پر اب خرید لائے تھے تاکہ باقاعدہ

تحفہ معلوم ہوا اس پر یہ فقرہ لکھ دیا

"اس کے لیے یار جو گلے کا ہار ہے"

مقررہ وقت پر مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور جو آتا وہ بغل سے ایک پیکٹ نکال کر میز پر رکھ دیتا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں تحفوں کی میز تحفوں سے لد گئی اور پارٹی اس کیک کو کاٹنے سے شروع ہوئی جو اسی تقریب کے لیے پچاس روپے صرف کر کے بنوایا تھا۔

سہ پہر سے چراغ جلے تک اس پارٹی کی چہل پہل رہی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے مہمانوں نے رخصت ہونا شروع کر دیا میں تو خود چاہتا تھا کہ یہ مہمان اب رخصت ہوں تاکہ میں ان قیمتی تحائف کو دیکھ سکوں۔ چنانچہ سب مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد میں بیوی کو لے کر تحفوں کی میز پر آیا۔ اور سب سے پہلے ودمانی کا تحفہ ڈھونڈ کر کھولا۔

میں نے ایک دم چونک کر کہا۔

"یہ کیا، یعنی بس تین رومال۔ زیادہ سے زیادہ تین روپے کے ہوں گے"

بیوی نے رضوی کے تحفے کا بکس بڑھا کر کہا۔ "یہ دیکھئے، یہ کوئی نرالی چیز ہے۔"

میں نے یہ پیکٹ کھولا تو اس میں بھی ایک مٹی کا گلدان نکلا جو عام طور پر ڈیڑھ روپے کا لاہور میں چودہ آنے کا ملتا ہی رہتا ہے۔ بیوی سہم گئی اور سمٹ گئی پھر

ایک عدد تولیا دکھایا —

"یہ احسان صاحب کا تحفہ ہے"

میں نے جل کر کہا۔ "رکھ دو۔ یہ عرقِ انفعال پونچھنے کے کام آئے گا۔ اور یہ کیا ہے۔ سینٹ کی شیشی بمشکل دس بارہ آنے کی ہوگی۔"

بیوی نے ایک ڈبہ کھول کر لپ اسٹک دکھائی۔ "یہ ہے البتہ تین چار روپے کی۔"

میں نے گھبرا گھبرا کر اب تمام پیکٹ کھولنا شروع کر دیئے۔ کسی میں کنگھی تھی تو کسی میں ازار بند ڈالنے کی تیلی۔ کسی میں تیل کی شیشی تھی تو کسی میں دھوبی کا حساب لکھنے کی کاپی۔ کسی میں اچار کی بوتل تھی تو کسی میں دستی آئینہ اور جب تمام تحفے دیکھ چکے تو اندازہ یہ ہوا کہ "یہ ہر مال ملے گا چھ آنے" قسم کے تحفے مجموعی طور پر چالیس روپے سے کسی طرح زیادہ کے نہ تھے۔

پارٹی پر صرف ہوئے تھے پونے تین سو۔ بیوی کو ساری اسی پارٹی کے لیے لا کر دی تھی ایک سو ساٹھ کی۔ گویا صرف کیے تھے ساڑھے چار سو کے قریب اور آمدنی ہوئی تھی صرف چالیس کی۔

بیوی تو ہنس ہنس کر دوہری ہو گئیں۔ مگر میں نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے کہا "اب کوئی بلائے سالگرہ میں، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے!"

خانہ بدوش

مولوی عبدالصمد صاحب بڑے بااصول بزرگوں میں سے ہیں۔ انتظامی قابلیت کے علاوہ مزاج میں احتیاط اس قدر ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بڑے بڑے نتائج سوچ کر بڑی سے بڑی بات کا چھوٹے سے چھوٹا نتیجہ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے اب مثلاً اپنے صاحبزادے عبدالاحد کے متعلق ان کو معلوم ہے کہ برخوردار نہایت مہلک طریقہ پر مدت سے عشق میں مبتلا ہیں اور یہ عشق اتنا شدید ہو چکا ہے کہ صاحبزادے شعر تک کہنے لگے ہیں مولوی صاحب اس عشق میں کوئی مضائقہ بھی نہیں سمجھتے اس لیے کہ ایک تو ان کو یقین ہے کہ یہ عشق صادق ہے دوسرے اتفاق سے برخوردار کو ایسی لڑکی سے عشق ہوا ہے جسے خود مولوی صاحب اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں گھر کی لڑکی لکھی پڑھی صورت شکل کی اچھی سلیقہ شعار سینے پرونے میں مشتاق چولہا ہانڈی کا بھی طاق مگر اسکے باوجود شادی اسلئے نہیں کرتے کہ جب تک بیٹی کی شادی کر کے

اس کو رخصت نہ کر دیں گھر میں بہو کی جگہ نہیں نکال سکتے بیوی نے لاکھ سمجھایا کہ جگہ دل میں ہونی چاہیے مگر مولوی صاحب حقائق کے مقابلے میں ضرب الامثال کے قائل نہیں ہو سکتے وہ اپنے گھر کا نقشہ دیکھ رہے ہیں کہ بغیر سمدھیانے کے گھر کا عالم چھوٹا گھر بڑے سمدھیانے کا ہے اگر واقعی سمدھیانے کا انتظام کریں تو کیا ہوگا۔ حالی تو یہ ہے کہ بمشکل تمام جو گھر الاٹ ہو رہے اس میں دو نام نہاد اور ایک واقعی کمرہ ہے اور گھر والے خدا کے فضل سے اتنے کہ رات کو ایک چارپائی باورچی خانے میں بھی بچھانا پڑتی ہے اور خود مولوی صاحب کے کمرے میں ان کی اہلیہ محترمہ کے علاوہ چار خورد سال اور تین سیانے بچے اس طرح سوتے ہیں کہ ان کے باری باری جاگنے رونے اور نیند میں بڑبڑانے کی وجہ سے خود مولوی صاحب کو مشکل ہی سے نیند آتی ہے۔ ان حالات میں اگر وہ صاحبزادے کے عشق کو پروان چڑھا کر بہو لے بھی آئیں تو ان کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ رہیں گے کہاں البتہ اگر لڑکی کے لیے کوئی ایسا ال جائے جو اسے بیاہ کر لے جائے تو وہ مرغیوں کی ڈھابلی نما چھوٹا کمرہ بہو کو دے سکتے ہیں جس میں آج کل صاحبزادی اپنی ایک چارپائی ایک چھوٹی سی میز کے ساتھ رہتی ہیں اور اگر میز کے ساتھ کرسی بچھانے کو جی چاہتا ہے تو میز کو کمرے سے نکال صحن میں یہ ارمان پورا کر سکتی ہیں اس لیے کمرے میں کرسی کی جگہ نہیں وہ تو بس قلمدان کی صورت کی ایک چیز ہے۔

مبتلائے درد محبت میاں احمد کو معلوم ہے کہ ان کی محبت اس وقت تک پروان نہیں چڑھ سکتی جب تک بہن کی شادی نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ وہ بیچارے رہ لیں

رات اسی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی معقول رشتہ آئے اور یہ قصہ طے پائے تو اپنی باری آنے سے پہلے ہی بہتیں آئیں اور کئی وہ خود لائے کبھی لڑکا فوق ثابت ہوا کبھی کھٹو، کبھی کوئی خاندانی نقص نکل آیا، کبھی عمر زیادہ ثابت ہوگئی نتیجہ یہ ہے کہ یہ بیل تو منڈھے چڑھ نہ سکی البتہ میاں احمد نے اپنی بہن نے عالی صاحب کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ خود ان کو گھر داماد بنالیں گی مگر یہ تجویز مولوی عبدالاحد صاحب کے سامنے پیش ہوئی تو وہ اپنی اصول پرستی کے ماتحت سخت برہم ہوئے کہ اول تو یہ بات نہایت غلط ہے کہ گویا ہم بہولانے کی جگہ لڑکا ہی رخصت کردیں اب پھر بیوی نے سمجھایا کہ آخر اس میں کیا برائی ہے ہم بھی گھر داماد لے آئیں گے مولوی صاحب نے اس کا صاف جواب دے دیا کہ ایک بے اصولی کا نتیجہ دوسری بے اصولی نہیں ہوسکتی نتیجہ یہ کہ یہ صورت بھی کارگر نہ ہوسکی بیچارے احمد کی فراق کی راتیں اور ہجر کے دن طول ہی کھنچتے چلے گئے

مگر وہ دن بھی آخر آیا کہ مولوی عبدالصمد صاحب کے اسی مختصر گھر کو جھاڑ پونچھ کر آئینہ کی طرح چمکا دیا گیا۔ مولوی صاحب کے کمرے سے تمام چارپائیاں نکال کر صحن میں تلے اوپر بچھادی گئیں اور ان کی جگہ کمرے میں کرسیاں بچھاکر قرینے سے لگا دیے رکھ دیے گئے بیچ میں گول میز بچھاکر اس پر خوبصورت سا میز پوش ڈال دیا گیا ایک گلدان میں پھولوں کا گلدستہ سجا دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اجلے کپڑے پہن کر آنکھوں میں سرمہ لگایا اور داڑھی میں کنگھی کی۔ میاں احمد بازار کے کئی چکر کاٹ کر بسکٹ پھل اور

مٹھائیاں لائے اس لیے کہ آج ان کا دوست قمر چلنے کے بہانے دراصل اس لیے گھر آ رہا تھا کہ مولوی صاحب اس کو اپنی غلامی میں لینے کو تیار ہو جائیں اور مولوی صاحب بھی آج کچھ ذاتی طور پر اور زیادہ تر بیوی کے سمجھانے بجھانے سے اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ چونکہ واقعی ان کی بیٹی کے لیے عرش سے تو بر اتر نہیں سکتا لہذا بال کی کھال نکالنے سے کوئی فائدہ نہیں اگر لڑکا ذرا بھی معقول ہو تو نسبت طے کر دینگے میاں احمد بھی خوش تھے کہ قمر میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ان کے والد اپنے داماد میں دیکھنا چاہتے ہیں اور آج ان کو یقین تھا کہ یہ نسبت ضرور طے ہو جائے گی لڑکے کو دیکھنے کے لیے مولوی صاحب نے احمد کی ہونیوالی ساس کو بھی بلالیا تھا اس لیے ان کا خیال تھا کہ اگر لڑکا مناسب نظر آیا تو منگنی کی رسم اسی وقت ادا کر دی جائے گی بلکہ مولوی صاحب کی بیوی نے اس مقصد کے لیے ایک انگوٹھی بھی نکال رکھی تھی۔

مقررہ وقت پر قمر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا. نہایت اچھی صحت ایک قبول صورت شائستہ نوجوان جس کو چلمن کے پیچھے سے عورتوں نے دیکھ کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور اظہار پسندیدگی کیا. خود مولوی کے چہرے سے بھی مسرت کا اظہار ہو رہا تھا. بڑی محبت سے اس کے سلام کا جواب دیکر مصافحہ کیا اور ایک کرسی پر بٹھا کر اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

اصولاً سب سے پہلے تعارف کی رسم ادا ہونا چاہیے مگر چونکہ میاں احمد تمہارا غائبانہ تعارف کرا چکے ہیں لہذا اس کی ضرورت نہیں سنا ہے کہ شیخ نظام الدین صاحب

مرحوم سے بھی تمہاری قرابت ہے۔

قمر نے نہایت تمیز سے جواب دیا۔ " جی ہاں وہ میرے حقیقی چچا تھے "

مولوی صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ " بالفاظ دیگر گویا تم ان کے بھتیجے ہوئے اور چونکہ میرے ان کے برادرانہ مراسم تھے لہٰذا اپنے ہی بچے ہو۔ صاحبزادے دراصل ہم سب ایک ہی خاندان کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ اصولاً میں خاندانی شرافت سے زیادہ ذاتی شرافت کا قائل ہوں۔

قمر نے کہا۔ " بجا ارشاد فرمایا میرا بھی یہی عقیدہ ہے "

مولوی صاحب نے کچھ اور بھی خوش ہو کر فرمایا بڑے علم دوست خاندان کے چشم چراغ ہو۔ برخوردار کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے ؟

قمر نے کہا۔ بی۔ اے کیا تھا کہ تقسیم کا قصہ چھڑ گیا۔

مولوی صاحب بولے " اصولاً تعلیم کے دو مقاصد ہیں۔ حصول معاش اور شائستگی۔ شائستگی ماشاء اللہ تمہارے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے البتہ معاش کے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے۔

قمر نے کہا پاکستان آنے کے بعد ہی ملازمت مل گئی تھی۔ کچھ دن کراچی میں رہا پھر تبادلہ پنڈی کا ہو گیا اور پچھلے مہینے لاہور آیا ہوں اور تنخواہ بھی غنیمت ہے سب کچھ ملا کر ساڑھے چھ سو مل جاتے ہیں امید ہے کہ عنقریب ترقی بھی مل جائے گی۔

مولوی صاحب نے پھر اصول بگھارنے شروع کیے میرے اصول کے مطابق مسرت کا مدار تنخواہ کی کمی زیادتی پر نہیں ہوتا۔ بہت سے کم تنخواہ پانے والے بہت سے زیادہ تنخواہ پانیوالوں سے زیادہ مطمئن ہوتے ہیں۔ بہر حال تمہارے حالات معلوم ہو کر بیحد مسرت ہوتی اب چونکہ میں ذرا با اصول آدمی ہوں وعدہ نہایت صاف گو بھی لہٰذا میں اپنے حالات بیان کر دوں کہ خاندان تو میرا وہی ہے جو تمہارا ہے۔ رہ گئی وہ لڑکی یعنی تمہارے دوست میاں احمد کی بہن تو اس کو میں نے کسی اسکول یا کالج میں تو نہیں پڑھایا البتہ خود باقاعدہ تعلیم دی ہے وہ اردو اور فارسی کے علاوہ خط لکھنے اور انگریزی فلمیں دیکھنے کے حد تک انگریزی بھی جانتی ہے۔

قمر نے کہا۔ جی ہاں اس سلسلہ میں احمد بھائی سے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔

مولوی صاحب نے کہا۔ ان سے تم کو جو کچھ معلوم ہوا ہے اس میں غلط بیانی کا بھی امکان ہے اس لیے کہ ان کو اپنی بہن کی شادی کی جلدی ہے بہر حال یہ لڑکی اگر میری دیکھی ہوتی تو میں اس کو ایک معقول لڑکی ضرور کہتا۔ بد صورت نہیں ہے۔

قمر نے بات کاٹ کر کہا۔ قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں احمد بھائی مجھے تصویر دکھا چکے ہیں۔

مولوی صاحب نے چونک کر کہا۔ تصویر! وہ بجا یہ بات غلط ہے مگر یہ بات درست ہے اور چونکہ میں رواج سے زیادہ اصول کا قائل ہوں لہٰذا میں صرف یہ تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ میاں احمد نے کوئی غلط تصویر تو نہیں دکھائی۔

احمد نے اپنے پرس سے تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے "ابا جان یہی تصویر دکھائی تھی میں نے"۔

مولوی صاحب نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ مگر یہ تصویر ذرا غلط ہے جو تصنع اس تصویر میں ہے وہ اس کی فطرت میں نہیں ہے"

قمر نے کہا۔ "بہر حال میں اس سلسلہ میں پورا اطمینان کر چکا ہوں اب صرف اپنے کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے بلکہ اپنے کو سپرد کرنے حاضر ہوا ہوں مجھ کو آپ کے ایسے ایک شفیق بزرگ، احمد بھائی کے ایسے ایک بھائی اور اس گھر کے ایسے ایک گھر کی ضرورت ہے۔

مولوی صاحب نے چونک کر کہا "یعنی کیا مطلب ہے۔ غالباً تم گھرانے کو گھر کہہ گئے ہو برخوردار۔

قمر نے کہا۔ جی نہیں گھرانے کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ گھر ہی کہہ رہا ہوں پاکستان آنے کے بعد سے گھریلو زندگی سے محروم ہوں کراچی میں ہوٹل کا ایک کمرہ میرا گھر تھا پنڈی میں ایک دوست کے گھر کا کمرہ لے رکھا تھا جب سے لاہور آیا ہوں تین ہوٹل بدل چکا ہوں اور اب مولوی صاحب کے رخ روشن کے تمام رنگ سوائے پیلے رنگ کے اڑ چکے تھے آنکھیں پھٹی پھٹی سی رہ گئی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں کچھ دیر خاموش رہ کر پھر اصولی بحث چھیڑ دی۔

"برخوردار۔ اصولاً انسان اس لیے شادی کرتا ہے کہ اپنا گھر بسائے۔ اب

سوال یہ ہے کہ تم جو شادی کرو گے تو دلہن رخصت ہو کر کہاں جائے گی۔

قمر نے کہا۔ رہا ایک دن کے لیے میں اپنے ایک دوست کے یہاں رخصت کرا کے لے جاؤں گا۔

مولوی صاحب نے وحشت سے پوچھا۔ رہا ایک دن کے لیے؟ اس کے بعد۔

قمر نے کہا۔ اس کے بعد آپ ہی کے قدموں میں رہوں گا۔

مولوی صاحب بسٹ پٹا کر بولے۔ یعنی۔ گویا

احمد نے باپ کو مطمئن کرنا چاہا۔ ابا جان قمر بھائی مکان کے لیے تو درخواست دے ہی چکے ہیں

مولوی صاحب نے بیٹے کو ڈانٹا۔ حکومت درخواست دینے کا مطلب یہ کہاں سے ہو گیا کہ مکان مل جائے گا اور اگر مکان مل جائے گی۔ اتنی اُمید ہے تو مکان ملنے سے پہلے شادی کے ارادے کا ان کو کس نے مشورہ دیا۔

قمر نے بدستور سعادت مندی سے کہا۔ میں خود اس خاطر بدخشی سے عاجز آ گیا ہوں اگر ارشاد کرنا چاہتا تو اگر کا نعم البدل سسرال ہو سکتی ہے

مولوی صاحب پہلے تو سناٹے میں رہ گئے پھر خاموشی سے اٹھ کر اندر چلے گئے

بیوی نے لاکھ سمجھایا کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے بات پکی نہیں کرتے تو کچی ہی رہنے دو قصہ تو ختم نہ کرو بالکل۔ چاہے تو بلاؤ غریب کو۔ مگر مولوی صاحب نے کسی ایک کی نہ سنی

جب احمد کی ہونے والی ساس نے ان کی ٹال میں ہاں ملائی کہ واقعی ایسے بے گھر کو کس طرح لڑکی دے دی جائے تو مولوی صاحب اور بھی شیر ہو گئے۔ احمد کو بلا کر صاف کہہ دیا کہ ان حضرت کو چاہو تو پیار کی رخصت کرو اور کہہ دو کہ جب تک گھر نہیں ملتا ادھر کا رخ نہ کریں میں اپنے گھر کو داماد دونوں کا اصطبل نہیں بنا سکتا پہلے گھر بنالیں تب کہیں جا کر مجھے راضی کرنے کی کوشش کریں۔

قمر نے جانے کس طرح چاہا ہی ہوگی اور کیا اثر لے گیا ہوگا مگر میاں احمد کو اپنی اس کوشش میں ناکامی کا جو صدمہ ہوا ہے اس کو ان کا دل ہی جانتا ہے اس تاثر کے ماتحت ان کی شاعری کچھ اور بھی چمک گئی۔ کئی ایسی نظمیں اور غزلیں کہہ ڈالیں جس میں انتہائی سوز و گداز تھا اور ان کو ہونے والی ساس سے بھی شکایت تھی کہ ان محترمہ نے بھی باپ کو سمجھانے کی جگہ بھڑکا دیا اور ان کی تائید کر کے شہ دینے سے کام لیا۔ میاں احمد اپنی محرومی قسمت کا ہفتہ منا ہی رہے تھے کہ ان کی ہونے والی ساس کے گھر سے ان کو اور ان کے والد کو ایک دعوتی کارڈ موصول ہوا یہ ان کی منگیتر کی شادی کا رقعہ تھا اور یہ شادی ان کے دوست قمر کے ساتھ ہو رہی تھی۔ مولوی عبدالصمد صاحب نے پوچھا "کس کا کارڈ ہے یہ"

احمد نے کارڈ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جو اصولاً خانہ بدوش ہی تھا وہ حقیقتاً گھر والا بن گیا"

اور کارڈ مولوی صاحب کو دے کر وہ اسی کمرے میں جا کر لیٹ گیا جو

اس نے غسل خانے میں پردہ ٹانگ کر اپنے لیے بنا رکھا تھا۔ نہ جانے ساری رات اس پر کیا کیفیت طاری رہی مگر صبح اس کی آخری نظم مکمل ہو چکی تھی جس کا آخری شعر یہ تھا۔

موت پر بھی نہیں ہے اب قابو
قبر ہوتی نہیں الاٹ ہمیں

آخری ارمان

کچھ ارمان پورے ہوئے کچھ حرمان بن گئے۔ مگر اب ایک تازہ ارمان پیدا ہوا ہے اللہ جانے یہ پورا ہوگا یا حرمانوں کی فہرست میں شامل ہو جائیگا اور قبر میں ساتھ جائیگا۔ وہ ارمان مکان کے متعلق۔ مکان سے مطلب ذاتی مکان نہیں ہے۔ ذاتی مکان کے سلسلہ کا ارمان تو مدت ہوئی حرمان بن چکا ہے اور میرا قاعدہ یہ ہے کہ جو ارمان ایک مرتبہ حرمان بن جاتا ہے میں پھر اسے حرمان کے شرف سے محروم کرنے اور ارمان بنانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ یہ ارمان تو صرف کرایہ کے مکان سے تعلق رکھتا ہے کرایہ کے مکان میں خدا کے فضل سے میں اب بھی رہتا ہوں اور جس مکان کی تمنا ہے اس کا بھی کرایہ ماہ بماہ نہایت پابندی سے ادا کرنے کا نیک ارادہ رکھتا ہوں۔ میرا موجودہ مکان نہایت صاف شفاف، ہوا دار اور ہر اعتبار سے نہایت آرام دہ بھی ہے۔ پھر بھی یہ مکان میرے لیے جہنم بنا ہوا ہے اور علین اس کے مقابلہ میں

تکلیف دہ ہے تکلیف دہ مکان کو اپنے لئے جنت الفردوس سمجھنے کو تیار ہوں ایک مرتبہ یہ بات پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھ کو مکان سے بخدا کوئی شکایت نہیں البتہ مالک مکان جو اس مکان کے سلسلہ میں میرے "نصف بہتر" بھی ہیں، میرے لئے ناقابل برداشت بنے ہوئے ہیں "نصف بہتر" سے میرا مطلب یہ ہے کہ مکان کے اس نصف حصہ میں وہ خود رہتے ہیں جو ہر اعتبار سے بہتر ہے اس مکان کو اگر آپ ایک گائے فرض کر لیں تو منہ میرے حصے میں آیا ہے اور تھن مالک مکان کے حصہ میں یعنی اس گائے کے سینگ خود کھا کر اس کو چارہ میں کھلاتا ہوں اور دودھ مالک مکان دوہتے ہیں۔ تازہ ہوا کھانے کے تمام دریچے ان کے حصے میں آئے ہیں اور مکان کی تمام نالیاں میرے حصے سے ہو کر گزرتی ہیں مکان کے سامنے کا باغیچہ ان کا ہے اور مکان کی پشت پر جو گندا نالہ بہتا ہے وہ میری قلمرو میں ہے پانی کا نل ان کے حصے میں ہے اور ایک ماتحت ٹونٹی میرے حصے میں بھی لگی ہوئی ہے اگر کبھی مالک مکان غسل نہ فرما رہے ہوں، ان کا باغ سینچا نہ جا رہا ہو، ان کے ملازم کپڑے نہ دھو رہے ہوں، ان کے باورچی برتن نہ مانجھ رہے ہوں تو بیوہ کی آنکھ کے آنسو کی طرح ایک نحیف و نزار سی دھار اس ٹونٹی سے بھی نمودار ہو جاتی ہے اور دوڑ کر گھر کے سب لوگ لوٹے اور گھڑے، صراحیاں لے کر لگ گئے ہیں کہ اس معجزے سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ سب کچھ سر آنکھوں پر منظور تھا بشرطیکہ صرف اتنا ہی ہوتا اس سے بھی کچھ زیادہ شکایتیں ہوتیں مگر

اسی قسم کی، مگر میری مصیبت کی نوعیت کچھ اور ہی ہے اور اس مصیبت کی تشریح کے لئے مجھ کو ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا۔

اگر سچ پوچھئے تو مصیبت میں نے خود خریدی ہے یا یوں سمجھئے کہ یہ مصیبت میں نے خود کرایہ پر لی ہے۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ مکان کی تلاش میں جب میں اس مکان تک پہنچا اور مالک مکان سے نیاز حاصل کیا تو ان کو مولویوں کی قسم کا بزرگ پایا، سفید نورانی داڑھی مگر نور عنقا، نہایت خشک قسم کا خوفناک چہرہ، تیوری پر بل یہ خواہ مخواہ پڑے ہوئے، چونکہ صبح صبح ان ہی بزرگ کی زیارت ہوئی تھی۔ لہٰذا دن بھر کھانا میسر نہ ہوا۔ البتہ مکان میسر آگیا اور وہ بھی اس طرح کہ جو کرایہ مانگا پیش کر دیا، چھ مہینے کا پیشگی مانگا وہ حاضر کر دیا، مکان کے سلسلے میں اپنے تمام حق تلفیوں کو اطاعت اور استحقاق تسلیم کیا اور ٹریجڈی یہ ہوئی کہ مارے سعادتمندی کے ان بزرگ محترم سے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ اس خاکسار کو اپنا کرایہ دار نہیں بلکہ فرزند سمجھئے گا اور مجھ کو بھی ناز رہے گا کہ میں آپ ایسے بزرگ کے زیر سایہ آگیا ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن یہ حضرت واقعی بزرگ بنے ہوئے ہیں شفقت مجھ سے ہی اسلئے خون کا کوئی رشتہ نہیں، شفقت میں البتہ کوئی کمی نہیں اسلئے کہ یہ حق میں نے خود ان کو دیا ہے نتیجہ یہ کہ بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت کچھ جیلر کی سی ہے اور یہ خاکسار ایک قیدی کی زندگی بسر کر رہا ہے، جب بھی چاہتے ہیں اس قید کو قید محض بنا دیتے ہیں جب جی چاہتا ہے قید بامشقت بنا دیتے ہیں ہر نفس پر ایک احتساب ہر قدم پر ایک روک، آدھی رات ہنسا چلے گئے

تو صبح پاشی ہوگئی۔ سنبھل گئے تھے یہ تو شریفانہ طور پر بھی یہی ہے پرچھائیاں دیکھ دیکھ کر بڈھے بڑے شریف زادے تباہ ہوتے ہیں ابھی سینما دیکھتے ہیں پھر فلم کے گیت گانے لگے اس کے بعد غسل خانہ میں گائیں گے خدانخواستہ اگر اسی طرح گھر نے کا شوق ہو گیا تو زندگی خطرہ میں ہے ہم بکھر جائے گی اور اگر یہ نوبت بھی پہنچی تو فلمی اداکاروں کی ادائیں اپنے میں جذب کریں گے ان کے فیشن اختیار کریں گے ان کی طرح بال بڑھائیں گے ان کی طرح سیٹی بجائیں گے، ان کی طرح لباس پہنیں گے اور یہ سب کچھ نہ بھی ہو تو یہ کون سا شریفانہ طریقہ ہے کہ رات کو ایک بجے گھر آ رہے ہیں۔

بیٹے سینما بند کیا کہ کتب بینی تو بری چیز نہیں ہے اس پر تو اعتراض نہ ہوگا ایک خوش مذاق انسان کتابیں پڑھ کر بھی سینما دیکھ سکتا ہے کتاب ہاتھ میں لئے بستر پر لیٹے ہیں سرہانے ٹیبل لیمپ جل رہا ہے گھڑی ٹک ٹک کر رہی ہے رات کا سناٹا ہے کہ بلا کیا ان کی آواز دیوار سے باہر نکل کر رہا ہے ٹھوکر آ آ کر میاں ایک بج رہا ہے، اب تو بتی بند کرو بھئی غضب خدا کا اس مہینہ بجلی کا بل سو روپیہ کا آیا تھا۔ رات رات بھر جلے گی بتی تو ظاہر ہے کہ ہزاروں کا ہی بل ہوگا۔ بیٹے کے کتب بینی کا شوق کا بھی پورا ہو گیا، ارادہ کیا کہ ریڈیو سنا کریں گے مگر ریڈیو لگانے کے دوسرے ہی دن خاص طور پر پیشی میں طلب کیا گیا اور وہ گھنٹہ بھر ریڈیو کی مذمت میں ساتھیوں پڑھا دیا گیا ڈاڈا تقریر یہ ہوئی کہ بجائے ریڈیو کے دماغ بجنے لگا اس تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ برخوردار یہ ریڈیو اور گراموفون قسم کی چیزیں وہ ہیں جو زندگی زہر کی طرح

انسان کو فرشتہ ختم کر دیتی ہیں فی الحال تو تم صرف ریڈیو سنتے ہو مگر تم کو نہیں معلوم کہ
یہی شوق اگر ترقی کر گیا تو ریڈیو سنایا بھی کرو گے ریڈیو اسٹیشن جانے لگو گے وہاں سے
گاؤ گے اور دنیا تمہارا گانا سنے گی اور فرض کر لو کہ نہیں گاؤ گے جیسا کہ تمہاری آواز سے
ظاہر ہے تو بھی یہ کیا بعید ہے کہ کچھ لوگ نہ مطلب یہ کہ ریڈیو اسٹیشن کی اگر چاٹ
پڑ گئی تو گانا نہ سہی رونا تو جانتے ہو اور دوسری بات یہ کہ برخوردار میں نے اپنے بچوں
کو پال کے آموں کی طرح پروان چڑھایا ہے میرے بچوں کو یہ گانے بجانے کا شوق
کبھی پیدا نہیں ہوا اور پیدا اس لئے نہیں ہوا کہ میں نے ان کے کان ہی گانے کی
آواز نہ پہنچنے دی۔ البتہ اب تمہاری وجہ سے میری بڑی بچی وہی غزل گنگنا رہی تھی جو
کل ریڈیو میں سنی تھی، خیر اس اس سے تو میں نے کہہ دیا کہ بند دق معاف کر کے رکھو تاکہ
اب کبھی جب تم گنگناؤ تو میں ایک کان تو بس تم پر بچی قربان کر دوں مگر اب تم سے کہتا
ہوں کہ یہ ڈھنگ شریف بھائیوں کے نہیں ہوتے، تم تو بجاؤ گے یہ نامعقول ریڈیو
اور رات چلتے اس کی آواز سن کر یہ سمجھیں گے کہ اس مکان میں کوئی صاحبزادی موسیقی
کا شوق پورا کر رہی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اس گھر میں یہ نہ ہو سکے گا اور اگر آپ
کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو کوئی اور مکان تلاش کر لیجیے۔

لیجیے ریڈیو بھی ختم سوال یہ ہے کہ آدمی آخر کرے کیا یہ پہاڑ سی زندگی یہ
غریب الوطنی کی تنہا زندگی کیسے کٹے گھر سے باہر رہیں تو آوارہ گرد گھومیں پھریں
تو ریڈیو نہ بجائیں میں کتب بینی نہ کریں اور تو اور اگر کبھی کوئی دوست ملنے آگیا تو اسکے

متعلق تحقیقات شروع ہو گئیں کہ یہ کون ہے کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے کیا مشاغل ہیں کتنی مرتبہ سزا پا چکا ہے اس شخص کے سر کن کون سے جرائم تھوپے جا سکتے ہیں اور جب اس تحقیقات کے باوجود بے ساختہ بے قصور نکلا تو بھی شک و شبہ کی توسیعی ایکٹ نے کافی گنجائش پیدا کر رکھی ہیں۔ کہنے لگے بھئی یہ کل جو صاحب تشریف لائے تھے تمہارے پاس کچھ غلط قسم کے آدمی نظر آئے مجھے ایک تو ان حضرت نے دروازہ اتنی زور سے بجایا کہ میں دروازے ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا تم کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے یہ مکان کن دقتوں کے ساتھ بنایا ہے اور اس مکان کے در و دیوار سے مجھ کو کیسا قلبی تعلق ہے وہ حضرت دروازہ بجا رہے تھے۔ اور میرا دل دھڑک رہا تھا کہ اب نکلے اس غریب دروازہ کے قبضے اور اب کرایہ چڑھا کر پھر یہ کہ ان کا حلیہ جو دیکھا میں نے تو کچھ اوباشوں کی سی صورت تھی یہ ہیں کون ؟

نہایت ادب سے عرض کیا "قبلہ یہ تو نہایت بزرگ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔" حضرت نور اللہ مشرقی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کہنے لگے دیکھئے نا وہی مثل صادق آتی ہے کہ ولی کے گھر شیطان بھلا یہ اولیاء کے نام لیوا اور یہ سوٹ ٹائی یہ کالر مجھے تو کچھ بے حد رنگین نظر آئے، یہ حضرت۔ اور صاحب صاف بات یہ ہے کہ میرا گھر ٹھہرا ایمان جیسی لڑکیوں کا گھر آپ کو شریف دیکھ کر یہ کرایہ دار بنا لیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ کے یہاں ہر قسم کے لوگ بھی آنے لگیں مجھے تو مستقل یہ اندیشہ رہا کہ یہ شخص ضرور جرائم پیشہ ہے اور اب آئی ہوگی۔ پولیس اس کی تلاش میں۔

ابھی ہم ان حضرت کو مطمئن کرنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ میز پر بکھرے ہوئے تاش دیکھ کر ایک دم بھڑک گئے یہ کیا تماش تو یہ کہئے کہ حضرت نور اللہ شرقی رحمۃ اللہ علیہ کے نام لیوا آپ سے تاش کھیلنے آئے تھے گویا اب میرا مکان قمار خانہ بھی بن گیا۔ گویا اب بڑھاپے میں یہ کھیلنے پڑیں گے یعنی اب یہ بھی ہوگا کہ میں اس بڑھاپے میں کھینچا کھینچا پھروں گا۔ دیکھئے مجھے بہرحال آپ نے ہی یہ مکان کے اس حصے کو اصطبل بنا سکتا ہوں مرغی خانہ بنا سکتا ہوں، مال گودام بنا سکتا ہوں، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے طفیل میں اس سفیدی میں سیاہی لگاؤں۔

عرض کیا، قبلہ آپ غلط سمجھے ہیں شغل کے طور پر ذرا بیچاری بازیاں رمی کی کھیل لی تھیں۔"

بات کاٹ کر بولے، وہ میں سمجھ گیا۔ وہ چار بازیاں ہی ہار کی بازی یا رجسٹر بابا ہم بازی نہیں جانتے ہیں۔ صاحب صاف بات یہ ہے کہ آپ کوئی اور مکان ڈھونڈ لیں میں درست لیتا معافی چاہتا ہوں۔"

وہ حضرت تو یہ کہہ کر تشریف لے گئے مگر ہم واقعی اس فکر میں ہیں کہ اس طرح زندگی کیسے بسر ہو سکتی ہے کرایہ پر مکان ضرور لیا ہے مگر یہاں تو معلوم ہوتا ہے کہ کرایہ پر جیل کی کوئی کال کوٹھری ملی ہے۔ مکان کیسے ہر وقت ٹلتے پھرتے ہیں اور ہر شخص یہی کہتا ہے کہ مکان تو خدا کے فضل سے آپ کے پاس موجود ہے کاش خدا کا یہ فضل ان ہی احباب پر ہو جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کو مکان کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تفریحاً مکان بدلنا چاہتے ہیں۔

اب ان ستمگاروں کو کیسے سمجھائیں کہ جس کو تم ہمارا مکان سمجھ رہے ہو۔ خدا دشمن کو بھی ایسا مکان نہ دے۔ خانہ بدوشوں پر رشک آتا ہے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے خانماں بربادوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں اور اگر یہی رنگ رہا تو اس مکان کے نئے کرایہ دار ہم کو بھی فٹ پاتھ پر رشک سے دیکھیں گے۔

افسانۂ ما

میرے باسی افسانے پڑھنے والے میرے تازہ افسانے کا اکثر تقاضہ کرتے رہتے ہیں تاکہ اس تازہ افسانے کو بھی باسی بنا کر اپنے تقاضے کو تازہ رکھیں اور میں ہمیشہ ان سے اسطرح کتراتا ہوں گویا میں ان کا مقروض ہوں اور واقعی مجھ کو بالکل اسطرح منہ چھپانا پڑتا ہے جیسے میں سچ مچ مقروض ہوں اور یہ سب تقاضا کرنیوالے کابلی پٹھان ہیں آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ قرض اور مقروضیت اور تقاضے کا تصور میرے ذہن میں اسقدر راسخ ہو چکا ہے کہ ان تقاضہ کرنے والوں سے میں بہانے حیلے اور عذر بھی بالکل اسی طرح کرتا ہوں جس طرح مقروض شرفا تقاضہ کرنیوالے پٹھانوں سے عذر اور عذر لنگ کرتے ہیں کہ ان صاحبان میں سے کوئی صاحب نازل ہوئے اور مجھ کو دروازے کے باہر عین اس وقت گرفتار کیا جب میں ترکاری والے سے مٹر کی پھلیوں کی گرانی پر تبادلہ خیال کر رہا تھا تو ظاہر ہے کہ ان کو کمرہ کھول کر بٹھانا پڑتا ہے سگریٹ کی ڈبیہ کھول

کہ جب لپے پر سے دیا سلائی کی ڈبیہ لانا پڑتی ہے گرمی ہو تو پانی کے لئے پوچھنا پڑتا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ کم سے کم لیمونیڈ اور زیادہ سے زیادہ لیمن اسکواش اور جاڑے کا موسم ہو تو چائے کیلئے نہ پوچھنا ایک افسانہ نگار کی وہ بداخلاقی ہے کہ اس کے ادیب اور انشاپرداز ہونے پر شبہ ہو سکتا ہے بہرحال ان تمام تمہیدی مدارج کے بعد وہ نوبت آتی ہے جس سے میرے نزدیک موت کا آنا زیادہ بہتر ہے یعنی وہ حضرت فرماتے ہیں کہ ہاں صاحب کوئی تازہ افسانہ؟ اور اب ادھر سے وہ تمام معذرتیں پیش ہوتی ہیں جو ایک مقروض اس خوفناک پٹھان کے سامنے پیش کر سکتا ہے جس سے اس نے قرض لیا ہو کہ صاحب، کیسا افسانہ اور کہاں کی افسانہ نگاری حال یہ ہے کہ سارا گھر اسپتال بنا ہوا ہے بیگم صاحبہ کو آپ جانتے ہی ہیں قلب کی پرانی مریض ہیں آج کل تو خیر یاقوتیوں کے رس کی بدولت دل ذرا ٹھہرا رہتا ہے مگر حال یہ ہے کہ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں رتی، بڑی بچی کے منھ میں داڑھ نکل رہی ہے جس نے والدین کی عقل ٹھکانے نہیں چھوڑی، ہے سارا منہ سوج کر رہ گیا ہے اور درد کی وجہ سے ایک چیخ زمین ہے تو ایک آسمان کل ڈاکٹر شگاف دے گا تو عقل برآمد ہوگی داڑھ کی صورت میں منجھلا بچہ پتنگ اڑاتے ہیں کوٹھے سے گر کر زندہ بچ گیا ہے اور ملیریا ڈانگ ہے ہم لوگوں کو ان بیماروں کو دیکھنے کیلئے دور دراز اور قریب کے اپنے عزیز جوق در جوق چلے آ رہے ہیں۔ کہ کل رات تو میں خود مجبوراً اپنی لکھنے کی میز پر سویا ان حالات میں افسانہ لکھ سکتا ہے اس ساری رام کہانی کے جواب میں ادھر سے ایک زیر لب تبسم اور پھر ایک

نہایت غیر متعلق سی بات، قصہ یہ تھا قبلہ کہ چار مہینے کی غیر حاضری کے اسباب کی آڑ دی جاتی ہے کہ رسالے کا خاص نمبر نکال دیا جائے اور آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ ہی کا افسانہ اس میں نہ ہوا تو پھر وہ خاص نمبر کیا ہوا۔ آپ کے لئے یہ معمولی سی بات ہے کہ بس قلم لے کر بیٹھ جائیے اور گھسیٹ دیجئے ایک چھوٹا سا افسانہ۔

یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بڑے سے بڑا جرم بھی کر سکتا ہے اور اگر ضبط سے کام لے تو دماغ پر کوئی مستقل ناگوار اثر پڑ سکتا ہے مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ یہ جو اطراف ملک میں جا بجا پاگل خانے ہیں ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو ضبط کرتے کرتے آخر خود ضبط ہو کر رہ گئے ہیں اور بعض اوقات جب میں اپنی روڈ کی طرف سے گزرتا ہوں تو پاگل خانے کی چار دیواری پر بڑی مانوس سی نگاہیں ڈالتا ہوں کہ شاید میرے تازہ افسانے مجھے یہاں تک لے آئیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ آخر یہ ایسی کون سی بات ہے جس کا میں نے خواہ مخواہ بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ صاف سی بات ہے کہ کوئی تازہ افسانے کا تقاضا کر رہا ہے تو کہہ دیجئے کہ نہیں ہے یا اگر ہے تو دے دیجئے۔ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ میں کتنا با اخلاق انسان ہوں اور ان فرمائشوں اور تقاضوں کو رد کرنا میرے لئے کس حد تک ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نگاری کے علاوہ میرا ایک اور کام بھی ہے کہ میں بال بچوں کے لئے قلم کی چکی چلا کر کچھ حاصل کروں ان کا پیٹ بھروں اور تن ڈھکوں، اور یہ تقاضہ کرنے والے زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کا رسالہ یا اخبار فی الحال ابتدائی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے اور جو صرف ادب کی خدمت کے

شوق میں گھر پھونک تماشہ دیکھنے میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی تمام گفتگو کا حاصل صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر معاوضہ پیش کرنے کی کبھی حیثیت ہوئی تو سب سے پہلے آپ کی خدمت کی جائے گی مگر فی الحال آپ ادب کی خدمت کیجیے کہ غالب کے گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔

بمشکل تمام افسانے کے ان قرض خواہوں کو ایک تازہ غزل دے کر اس طرح ٹالا جاتا ہے جیسے تقاضہ کرنے والے پٹھان کو اصل کے بجائے سود دے کر رخصت کیا جاتا ہے اور خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے ؎

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

رہ گئے وہ تازہ افسانے مانگنے والے جو افسانہ نگار کو بھی سڑک کا نل نہیں بلکہ اپنی فرمائشات میں مبتلا ایک ایسا انسان سمجھتے ہیں اور اس کی محنت کا معاوضہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے ان کیلئے تو دیدہ و دل فرش راہ رہتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس معاوضے کا پورا حق ادا کر دیا جائے اب یہ دوسری بات ہے کہ ہر وہ بات نہیں ہوا کرتی جس کے لئے انسان کا دل چاہے خصوصاً مجھے اپنا اندازہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر میرے حالات عموماً کچھ ناسازگار رہا ہی کرتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آتا بہت کچھ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاید میں نے کبھی کسی فرمائش کی درخواست نامنظور کر دی ہے اور اس کے دل سے یہ بد دعا نکل گئی ہے کہ چنانچہ تو بھی کبھی سکون سے افسانے نہ لکھ سکے گا۔

اس بد دعا کا اثر دیکھ لیجیے کہ کل ہی ایک رسالے کے نہایت باحوصلہ مالک افسانہ مانگنے تشریف لائے اور افسانہ مانگنے سے پہلے ہی چیک بک نکال کر چیک کاٹ دیا کہ یہ حاضر ہے مگر افسانہ ہم کو جلد ہی چاہیے بس آپ کے خاص رنگ کا شاہکار ہو جی چاہا کہ اس شریف اور واقعی نجیب الطرفین انسان کو اٹھا کر کلیجہ سے لگا لیں مگر ان کی عبارت نے خود ان کے کلیجے کو بہت دور کر رکھا تھا دوسرے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ حضرت اس خلوص اور عقیدت سے یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا ہے لہذا جذبات کو بمشکل دبا کر نہایت بے اعتنائی سے چیک میز پر گویا ڈال دیا اور ان سے وعدہ کر دیا کہ پرسوں تک افسانہ منگا لیجیے گا۔

آپ کو معلوم ہے چیک کے کیش کرانے اور کیش کرانے کے بعد کے واقعات میں کم سے کم ایک دن تو لگ ہی جاتا ہے اور جب تک چیک کیش نہ ہو دماغ میں افسانے کے پلاٹ کیلئے جگہ نہیں نکلتی، ضروریات کی فکر سے دماغ کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے چنانچہ ایک دن تو بینک اور بازار کے چکر میں نکل گیا دوسرے دن کی ابتدا کچھ نحس ہوئی گھر کی نہایت پرانی ملازمہ نے آکر جگا دیا اور ان کی صورت دیکھتے ہی کلیجہ دھک سے ہو گیا کہ خدا ہی خیر کرے۔ ان کی زیارت کے بعد دن بھر جو کچھ ہو سکتا ہے اس کا بارہا تجربہ کر چکے ہیں ایک مرتبہ ان محترمہ کی صورت دیکھی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اسی دن والد صاحب کا انتقال ہوا اور زندگی بھر کیلئے یتیم بن گئے کچھ دنوں کے بعد ان محترمہ نے پھر جگایا اور یقین جانیے کہ اسی دن دفتر کے ایک

افسرِ اعلیٰ سے وہ تُو تُو مَیں مَیں ہوئی ہے کہ اگر وہ افسر واقعی شریف نہ ہوتا تو ملازمت ہی گئی تھی ہاتھ سے مگر دو سال کیلئے ترقی بند ہو گئی۔ تیسری مرتبہ کا تجربہ یہ ہے کہ صبح اٹھ کر ان کا دیدار ہو گیا تھا راستے میں بائیسکل کا اگلا پہیہ ایسا نکلا ہے کہ وہ ہسپتال میں اس وقت ہوش آیا جب ایک نرس دوسری نرس کو سمجھا رہی تھی کہ یہ سرکس کا آدمی ہے ایک پہیے کی بائیسکل پر کرتب دکھا رہا تھا کہ لاری سے ٹکرا گیا۔ مختصر یہ کہ آج ان محترمہ نے پھر جگایا کہ اٹھیے سرکار بابو آیا ہے وہ کہتا ہے کہ آغا جانی کی ساس کا انتقال ہو گیا ہے یہ خبر بجائے خود کچھ کم نہ تھی ایک زندہ آدمی کے لیے اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے مگر ان محترمہ کو دیکھ کر دل کو کچھ یقین سا ہو گیا کہ شاید خود اپنے انتقال کیلئے بھی آج ہی کا دن مقرر ہو۔ اب ذرا اس دن کی روداد سن لیجیے آغا جانی کی ساس کی میت میں شرکت کی۔ قبرستان میں ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے اندر اوندھے منہ گرے اور چشمہ قبر کے اندر ہی رہ گیا۔ خدا غریق رحمت کرے بہت دنوں کا ساتھی تھا۔ یہ چشمہ بھی قبرستان سے واپسی پر تانگہ وہ ملا جس کا گھوڑا سودا کے گھوڑے کا بھانجہ تھا اور اپنے ماموں جان کی وضع کا سختی سے پابند۔ آدھ گھنٹے کا راستہ جب اس نام نہاد گھوڑے نے دو گھنٹے میں طے کیا اور گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ پر قلب کا ایک دورہ پڑ چکا ہے اور دوسرے کا شدید انتظار ہے ان بیچاری کے قلب کی حالت واقعی یہ ہے کہ آغا جانی کی ساس کیا معنی کسی کی ساس بھی

داعی اجل کو لبیک کہیں ان کے دل کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے البتہ شکر یہ ہے کہ خود اپنی ساس کے انتقال کے وقت ذرا افاقہ رہا تھا بہرحال اسبغول ڈھونڈنا پڑا ماموں کیلئے اور کچھ دوسری مفرح قلب معجونوں اور مربوں کیلئے رات گئے تک ماموں کے بس بھگائے گئے۔ بید مشک کے شربت بنائے گئے اور جب خدا خدا کر کے بارہ بجے سو گئیں تو میز پر آئے کاغذ نکالا، قلم میں روشنائی بھری، ٹیبل لیمپ میں غسلخانے کا بلب نکال کر لگایا اور اس کا بٹن دبانے ہی والے تھے کہ پھٹ سے ایک آواز آئی ؎

ایک شعلہ سا گرا شیشے سے پیمانے میں
وہ کرن پھوٹی کہ اندھیرا ہوا مے خانے میں

فیوز اڑ گیا اب بتلائیے کیا کیا جائے، یہ بھی تو پتہ نہیں کہ دیا سلائی کی ڈبیہ کہاں رکھی ہے، فیوز جوڑنے کا تار کہاں ہے اختلاجی بیوی کو جگانا اور قیامت کو بیدار کرنا ایک ہی بات ہے خود ہی دبے پاؤں ٹٹولتے ہوئے باورچی خانے میں پہنچے اور اندھیرے میں ٹٹول رہے تھے کہ چیخ فضا میں گونجی "ارے کون" —

لاحول ولا قوۃ یہ وہی مبارک و مسعود ملازمہ تھیں جلدی سے کہا "بوا میں ہوں۔ میں دیا سلائی کی ڈبیہ ڈھونڈ رہا ہوں" اور ان محترمہ نے چیخنا شروع کر دیا۔

"ارے دیا سلائی کی ڈبیہ جیسے میرے پلنگ ہی پر تو رکھی ہے" غرضیکہ یہ سمجھیں کہ خود ہی ایک ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں دیا سلائی کی ڈبیہ بجھا دی میں بدستور

صفائی پیش کر رہی تھا، فیوز اڑ گیا ہے تا اندھیرے میں دیا سلائی کی ڈبیہ ڈھونڈھنا بھی
تو مشکل ہے بغیر دیا سلائی کے لاؤ مجھے دو اور ناخترمہ نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے
ہی میں دیا سلائی کی ڈبیہ میری ناک کو سنگھا دی دیا سلائی کی تیلیاں جلا جلا کر فیوز کا
تار ڈھونڈھا اور ایک اخبار کو جلا کر اس کی روشنی میں فیوز جوڑا ہی تھا کہ گھڑی نے
ساڑھے بارہ کا ادھا بجا دیا پھر بھی میز پر آنا پڑا اس لئے کہ صبح وہ آنے والے تھے۔
اخبار بیچ جن کے دیئے ہوئے چک ملے ہیں اب صرف چھاپنے باقی رہ گئے تھے۔
مگر میز پر ٹیبل لیمپ لگانے میں پھر فیوز اڑ جانے کا اندیشہ تھا لہذا طے یہ کیا
کہ میز کو گھسیٹ کر چھت سے لٹکے ہوئے بلب کے نیچے لے جائیں اور لکھنا
شروع کر دیں۔ میز کو گھسیٹنا ہی تھا کہ آواز آئی کون ہے بھئی استغفراللہ بیوی صاحبہ
کی آواز تھی جو مشکل سے ہی نکلی جلدی سے جواب دیا میں ہوں میز گھسیٹ رہا ہوں۔
جواب ملا دو بجے جلدی سے اب جو جا کر بتی جلاتے ہیں تو وہ پسینے میں شرابور بیٹھی
آنکھیں پھاڑے نہایت وحشت سے گھور رہی ہیں اور گھبرا گھبرا کر کہہ رہی ہیں پانی
اختلاج ہاتھ میرا جا رہا ہے تم کہ دو قدموں پر میرا جیسا آدمی خود اختلاج میں مبتلا ہو جاتا
ہے۔ اور گھبرا گھبرا کر عجیب وغریب حرکتیں کرتا ہے مثلاً پانی کے بجائے سر دانی
اٹھا لی میز سے اس کو دو کی تیلیوں سے لیمپ اٹھا کے گر ڈرتے ادھر ادھر بھی
آیا کہ یہ بھی غلط ہے آخر جو چیز سمجھ میں آئی تو ہے تقریباً سے پانی انڈیلا اور لیئے
سرہانے بیٹھا کر پانی پلایا جلدی سے ماتھا نوچ کر اس کی ایک آدھ تاس لگا دی

جب ذرا دل ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی نہیں کہ چور ہے اور ٹرنک گھسیٹ رہی ہے جس میں ان کی چھوٹی بہن کے جہیز کے جوڑے رکھے ہیں، ان سے نہایت خندہ پیشانی سے باتیں کیں، ان کا دل بہلایا اور ان کو سونے کی ترغیب دی بمشکل وہ سوئی ہوں گی کہ گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے گویا ڈیڑھ گھنٹے تک یہ تیمارداری کی گئی اور اب پھر میز پر آئے اس لئے کہ صبح وہ افسانہ لینے والا ضرور آ جائیں گے، ڈبیہ سے نکال کر گلوری کھائی سر پر ہاتھ پھیر کر گویا یکسوئی حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک کاغذ پر لکھا ۷۸۶ میں ہمیشہ بسم اللہ کے اعداد برکت کے لئے لکھ دیا کرتا ہوں۔ عنوان کی جگہ چھوڑی اور افسانہ شروع کر دیا۔

نسیم اپنے باپ کا بیٹا تھا۔

اور ایک دم قلم رک گیا یہ کیا واہیات بات ہوئی نسیم، کلیم، شمیم اپنے اپنے باپوں کے بیٹے ہوتے ہیں اور اس میں ندرت خیال کیا ہے، اگر اس کو اس طرح لکھا جاتا کہ شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا تو یہ گویا ایک لوچ اور ایک شوخ قسم کا انداز بیان ہو جاتا، لہذا یہ کاغذ الگ کر دیا، دوسرے کاغذ پر پھر ۷۸۶ لکھ کر عنوان کی جگہ چھوڑی اور افسانہ شروع کر دیا۔

شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا۔

اور ایک دم رات کے سناٹے میں آواز گونجی "ابا۔ آ۔ آ" شمیم نہیں بلکہ میں اپنے بیٹے کا باپ ضرور تھا جو مجھ کو پکار رہا تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ بیگم صاحبہ کا استراحت

پھر وہ جاگ اٹھے وہ ڈرا ہوا لگا اور بستر پر دیکھا کہ صاحبزادے سہمے ہوئے بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔ ان کو لٹا کر تھپکا۔ لوری کے طور پر ڈاکٹر اقبال کا شکوہ سنایا اور جب وہ سو گئے تو پھر چوروں کی طرح میز پر آ گئے۔ مگر اب یہ سمجھ ہی نہ آتا تھا کہ شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ فرض کر لیجئے کہ تھا بھی تو ہم سے کیا رہ گا ہماری بلا سے اس کاغذ کو بھی ایک طرف کھسکا دیا اور ایک تیسرے کاغذ پر ۸۹ کے بعد غور کے لئے جگہ چھوڑ کر کچھ لکھا۔ لکھ کر غور کیا۔ کاغذ بدلا پھر لکھا۔ پھر غور کیا۔ کاغذ بدلا پھر لکھا۔ پھر غور کیا۔ پھر کاغذ بدلا اور اب جو بیوی نے آکر شانے پر ہاتھ رکھا ہے تو آنکھیں کھول کر دن چڑھا ہوا دیکھا بہت سے بے شمار ۸۷ لکھے ہوئے کاغذات میز پر رکھے ہوئے تھے اور ہر کاغذ پر نصف سطر تھی۔ کسی میں نسیم اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ کسی میں شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا۔ کسی میں نسیم یتیم تھا۔ اور کسی میں شمیم لاولد تھا الغرض وہ افسانہ جتنے ذہن میں آ سکتے ہیں وہ لکھے تھے۔ لاحول پڑھ کر میز سے اٹھے اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا تو افسانے کا عنوان نظر آیا۔ وہ گھبرائے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ دروازہ بند کیا میز پر آ کر کاغذ اٹھایا ۸۰۰ لکھا اور عنوان لکھا افسانہ کا اس عنوان کے تحت وہ سب کچھ عرض کر گئے جو بیتی تھی۔ اب خدا جانے یہ افسانہ بن پایا یا نہیں۔

عندلیب صاحب کے نام

عاول کے دو پرچے ملے۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی اور کچھ لکھنے کی تحریک تو پیدا ہوئی۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھا جائے جسے پڑھنے والے پڑھیں بھی۔ دوسرے نمبر میں صفحہ اٹھائیس پر آپ کا مضمون وادیٔ فکر دیکھ کر طے کیا کہ وہ لکھو جو آسانی سے پڑھا جا سکے۔ آپ نے رسم الخط کی بحث چھیڑی ہے اور بہت آسان طریقہ نکالا ہے کہ اردو کا رسم الخط تو اپنا ہی رکھا جائے۔ البتہ اس کے وہ بہت سے حروف جن کا تلفظ اردو میں یکساں ہے، اردو سے نکال دیئے جائیں اور صرف ایک ایک حرف رکھ لیا جائے۔ مثلاً (ت) اور (ط) میں جب کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں کی آواز اردو میں ایک سی ہے تو دونوں کی کیا ضرورت ہے۔ صرف (ت) کافی ہے (ا) اور (ع) کی آواز بھی یکساں ہے تو (ا) کو رہنے دیجیے (ع) کو رخصت کیجیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ناراض ہو جائیں گے تو ان کو عربی میں

اُردو لکھنے دیجیے۔ آپ کیوں نہ اُردو میں اُردو لکھیں (س) (ص) اور (ث) میں سے صرف (س) کافی ہے (ذ) (ز) (ض) اور (ظ) میں سے صرف (ز) کو رہنے دیجئے اور صاحب (ہ) (ح) اور (ہ) والا قصہ تو بہت ہی واہیات ہے یہ جو چھوٹی (ہ) کہلاتی ہے یہی تو ایسے بڑے کام کی چیز ہے۔ مختصر یہ کہ جب (ا) اور (ع) (ت) اور (ط) (ح) اور (ہ) (ث، س، ص) (ذ، ز، ض، ظ) کی آواز ایک ہی ہے تو ایک حرف لکھ کر بجائے اتنے حروف کی آخر کیا ضرورت ہے آپ نے اس تفصیل کا جو خلاصہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ املا کا دار و مدار صوت یا آواز پر ہے اور جب اُردو میں ان مختلف حروف کی ایک ہی آواز ہے تو املا کی غلطیوں کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اور اُردو خواہ مخواہ اُردو ہوتے ہوئے بھی اُردو نہیں بن جاتی۔ عربی بنی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں تو اس طالب العلم کا قصور نہیں آتا جس نے اونٹ کو محض اس خیال سے (اونت) لکھا تھا کہ اونٹ بہرحال عرب کا جانور ہے اس لیے (ا) سے تو ہو ہی نہیں سکتا (ع) سے ہوگا۔ اور چونکہ عربی میں (ٹ) نہیں ہے۔ لہٰذا (ٹ) کی جگہ (ت) لکھنا چاہیے اگر ممتحن صاحب نئی زبان ہوتے تو اس طالب العلم کو بنچ پر کھڑا کرنے کی جگہ خود میز پر کھڑے ہو کر اس کی تعریف کرتے۔ ہمیں آپ سے ایک بات اور عرض کرنا ہے اور لبیب صاحب کہ اس ترکیب سے صرف اُردو کا رسم الخط آسان ہو جائے گا بلکہ ہمارے بچے سیکھنے والے مشکل املا سے آسانی بھی شاید چھوڑ دیں (ہ، ح، ط، ت، س، ث، ذ، ض، ظ) کی وجہ سے اُردو کا مزاج خواہ مخواہ عربی بنا ہوا ہے یہ حروف جب آپ نے

رسم الخط سے نکل جائیں گے تو اُردو جو غالباً "عُردو" بنی ہوئی ہے خالص اُردو بن جائے گی اور اس اُردو کو آسان ہروف لکھنے کے لیے آسان زبان بھی اختیار کی جاتے گی۔ مگر اسی نمبر میں آپ پڑھیں گے دو شیر ہیں ایک سفہ سولہ پر ہے

دیکھتا ہوں رات کو جب وہ ستارے آس پاس
جانے کیوں اس وقت ہو جاتا ہے میرا دل اُداس

اس شیر میں کسی تبدیلی کی کوئی ذرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مگر دوسرا شیر جو سفہ اُنیس پر رُوحِ انتخاب کے زیرِ انوان ہے چونکہ اُردو کا شیر نہیں ہے لہازا اس کو اُردو بنانے کے لیے یوں لکھنا پڑے گا۔

آتی ہیں غم کے باد خوشی کی بھی ساعتیں
اب وہ زمانہ گردشِ دوراں نہیں رہا

ہو گا یہ کہ یا تو آپ ساحبان اس ترہ کے شیر نہ کہیں گے یا کہیں گے تو اس ترہ کہیں گے کہ ان کے ارابی الفاظ بھی اُردو ہروف میں آ کر مشرف بہ اُردو ہو کر کچھ کے کچھ نظر آئیں گے مگر ان کے مفہوم و معانی میں کوئی فرق پیدا نہ ہو گا۔

اندلیب ساحب مجھ کو ایتراف ہے کہ آپ کے مجوزہ رسم الخط میں یہ ایڈیٹ کس مشکل سے تحریر کیا ہے قدم قدم پر املا کی غلطی کا خوف مجھ پر تاری رہا۔ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ آج چھتیس سال کے باد میں نے آپ کا سہارا لیکر کتابت اتنا ہم والد مرحوم مولوی مہدی احمد (احمد کوہی نے احمد اس لئے نہیں لکھا کہ آپ نے راستہ دکھایا ہے کہ احمد و محمد کو احمد و محمد اور رحیم و صلوٰۃ کو صلوم و صلوٰۃ ہی لکھنا چاہیے ایسے الفاظ کی تعداد

دو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ ہو گی اور ان کو کلیے کا استثنا سمجھنا چاہیے) صاحب مرحوم
دغفور کی روح سے لیا ہے، صاحب صرف اس ذرا سی غلطی پر کہ میں نے ایک مرتبہ آمدہ
لکھ دیا تھا جو ان کے نزدیک (عمدہ) ہونا چاہیے تھا کافی مار کھائی تھی اور جب
اس مار کے پیش نظر دوسری مرتبہ (میری دردازے کردگیری و سدانہ) لکھا ہے تو
کافی سے بھی زیادہ آزاد ہوتی تھی میری کاش آپ والد مرحوم کے ہم عصروں میں ہوتے
اور یہ عقیدہ تجویز میری عرصت سے پہلے ہی پیش کر چکے ہوتے۔ اس کا فائدہ تو اب میری
اولاد کو تو خاطر خواہ پہنچ جائے گا۔ مگر میرے والد کی مجھ خاکسار اولاد کو مگر آپ کی اس
تاخیر کی وجہ سے نہ پہنچ سکا۔

اندلیب صاحب خدا کرے آپ کی یہ تجویز مقبول عام ہو اور عوام آپ کی اس
نیک صلاح کو شرفِ قبول عطا کریں۔ اس کے باوجود بہت سی آسانیاں پیدا ہونے
کی صورتیں نکل آئیں گی۔ ممکن (ہے) بھی بڑی نامراد چیز ہے صاحب اس کو تو خدا
کے واسطے اپنے رسم الخط سے اڑا دیجیے اس کی جگہ بھی الف کا استعمال میں لا دیے۔
ممکن (ہے) کو اگر ہم آ اے لکھیں تو کیا ہرج ہے (ر آ ذ) کو آ آ د۔ مقتسب ہو کو اسی
طرح کا لکھنے لگیں۔ معلوم نہیں کیوں میں ذاتی طور پر اس ہمزہ سے بہت گھبراتا ہوں
اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں جن کے نکل جانے کے بعد بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی
دوسرے پھر تو ہم یہ جوڑ کر لکھنے کی لعنت بھی ختم کر دیں گے۔ مزے سے انگریزوں کی طرح لکھا
کریں گے۔ جیسے اب۔ ان مل ی اب۔ ش اوان ی۔ کتنا خوب ہے ...

ہوجائے گا ہمارا ٹائپ رائٹر۔ بہرحال میں ادھر اس تجویز پر غور کر رہا ہوں آپ اُدھر غور فرمایئے کہ کوئی نہ کوئی سورت نکل ہی آئے گی۔

گرر انگہ اس ہمزہ کے ملعلے کو معمولی سمجھ کر نزر انداز نہ فرمایئے گا۔ مکرمی حفیز ساہب ہوشیارپوری آداب امذ کرتے ہیں اور فرست کی تلاش میں ہیں کہ آپ کو کوئی تازہ غزل جلد سے جلد بھیجیں۔

(راہقر الاباد شوکت تھانوی)

۲۰ ویں صدی

میر صاحب کا ۳۱ دسمبر ۱۸۹۹ء کی رات کو گیارہ بجکر انسٹھ منٹ پہ پیدا ہونا ایک مستقل عذاب بن کر رہ گیا ہے اُس مخلوق خدا کے لیے جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئی ہے بات بات پہ بیسویں صدی کے طعنے۔ ۵۱ء راولپنڈی کا مقدمہ سازش ہو یا مسئلہ ختم نبوت۔ جنرل نجیب اور شاہ فاروق کا قضیہ ہو یا بیگم صاحبہ جوناگڑھ کا مقدمہ، ایرانی تیل کا قصہ ہو یا یو۔ این۔ او میں کشمیر کا مسئلہ ان میں سے ہر ایک کا تعلق ان کے نزدیک براہ راست بیسویں صدی سے ہے گویا اگر یہ انیسویں یا اکیسویں صدی ہوتی تو یہ واقعات اور یہ حالات پیدا نہ ہوتے خیر یہ تو پھر بھی بڑے بڑے مسائل ہیں ان حضرت نے تو کچھ اپنا تکیہ کلام بنا رکھا ہے بیسویں صدی کا ملازم سودے کے پیسے کھا جائے تو یہ بیسویں صدی کا قصور ہے، دھوبی ایک ازاربند گم کر دے تو یہ بیسویں صدی کا کرشمہ ہے، تانگے والا کرایہ پر لڑ بیٹھے تو اس کی ذمہ داری بیسویں صدی پہ ہے اور تو اور۔۔۔

بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ خود ان کے گھر میں موجود ہے یعنی ان کی اہلیہ محترمہ۔ جرم ان بیچاری کا یہ ہے کہ شوہر نامدار کی طرح انیسویں صدی کے آخری ہفتے پر پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ بیسویں صدی کی پیداوار میں سے ہیں۔ میر صاحب کے تمام عزیزوں کی۔ اہل محلہ کی اُن کے گھر میں آنے جانے والوں کی۔ سب کی رائے یہ ہے کہ یہ بیچاری عورت خدا جانے میر صاحب کے ساتھ کیونکر نباہ کر رہی ہے۔ مگر ایک میر صاحب ہیں کہ آئے دن اس سے روٹھے ہی رہتے ہیں اور چونکہ ہم واقف ہو گئے ہیں۔ میر صاحب کے گویا محرم راز۔ لہذا شامت ہماری ہی آتی ہے کہ چلے آرہے ہیں بیوی سے روٹھے ہوئے اور برس رہے ہیں ہم پر کہ۔۔

"میاں لاحول ولاقوۃ دیکھ رہے ہو اس بیسویں صدی کو شریکِ زندگی بھی شریک زندگی نہیں ہے۔ شوہر کا درجہ خدا نے کیا بنایا تھا اور کیا بن کر رہ گیا ہے بھلا غور فرمائیے کہ یہ میرے کھانے کا وقت، تھکا ہارا گھر پہنچا کہ بیوی لا کر دسترخوان بچھا دے گی توے سے گرم گرم روٹیاں اتارے گی اور جس طرح بیویاں میاں کو کھانا کھلاتی ہیں مجھے بھی کھلائے گی مگر دروازہ جو کھٹکھٹاتا ہوں تو جواب ملتا ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ نماز پڑھ رہی ہوں۔ میرے کھانے کا وقت ملاحظہ ہو اور بیگم صاحبہ کا یہ کلام فرمانا ملاحظہ ہو۔ زندگی سے دل کھٹا ہو جائے تو اور کیا ہو۔ زندگی کے لیے زمانہ بھی ملا تو بیسویں صدی کا۔"

عرض کیا کہ "قبلہ و کعبہ ان بیچاری کا اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے کہ آپ زندگی

ہی سے بیزار ہوئے جاتے ہیں۔ تشریف رکھیے، ماحضر تناول فرمائیے۔ پھر عرض کیجیے گا کہ بھابی صاحبہ کس حد تک قصور وار ہیں؟ مشتعل ہو کر بولے۔ کمال کرتے ہیں صاحب آپ بھی یعنی آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بندہ نواز آخر ہمارے والد کی بھی بیوی تھیں۔ یعنی والدہ محترمہ۔ حضرت عالم یہ تھا اُس جنتی بیوی کا کہ جاڑے کی راتیں ہیں قیامت کی سردی ہے بارہ بج چکے ہیں مگر والد صاحب کی شطرنج کی بازی ختم نہیں ہوتی ہے لہٰذا وہ باورچی خانے میں بیٹھی اونگھ رہی ہیں کہ باہر سے کھانے کی طلبی آئے روٹیاں ڈالیں اور کھانا بھجوائیں باہر۔ مگر بات کیا تھی وہ تھی اُنیسویں صدی جب شوہر شوہر تھا اور بیوی بیوی۔" پیچ بیچ عرض کر دیا کہ "میر صاحب قبلہ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ رات دیر میں واپسی ہوئی سینما چلا گیا تھا آخری شو میں گھر آ کر یہ مناسب نہ سمجھا کہ بیوی کو جگاؤں خود باورچی خانے میں چلا گیا اور جو کچھ مل سکا ٹھنڈا سیدھا کھا لیا۔

میر صاحب نے ترکی بہ ترکی فرمایا۔ یہ ہے بیسویں صدی کہ بیوی کی نیند میں خلل واقع نہ ہو خواہ شوہر کو ہانڈیاں اُچھالنا پڑیں۔ آپ ہی لوگوں نے ان عورتوں کے دماغ خراب کیے ہیں۔ اس بیسویں صدی کے شوہر زن مرید جورو کے غلام اور — اور — اب میں کیا عرض کروں۔"

نوکر کو آواز دے کر پہلے تو منگایا میر صاحب کے لیے کھانا اس کے بعد عرض کیا "حضور والا گستاخی معاف۔ سوال تو یہ ہے کہ مجھ کو کیا حق تھا کہ میں بغیر کسی اطلاع کے رات کو ایک بجے تک گھر کے باہر رہوں۔"

میر صاحب نے پیشانی پہ ہاتھ مار کر فرمایا۔ "واہ رے بیسویں صدی کے شوہر یہاں اطلاع کے معنی اجازت کے ہیں گویا وہ زمانہ آ لگا ہے کہ مجازی خدا اب گویا اجازت لیا کرتا ہے کہ بیوی اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ مجھے ذرا ٹیلیسکوپ جانا ہے رات کو دیر سے واپسی ہو گی۔ اجازت ہو تو چلا جاؤں ورنہ جو حکم ہو شوہر جو ہوا۔ تابعدار جو ہوا۔"

عرض کیا۔ فرض کر لیجیے کہ اطلاع کے معنی بقول آپ کے اجازت ہی کے ہیں تو بھی اس میں مضائقہ کیا ہے بھلے۔ برادر من اسی کا نام ہے بیسویں صدی۔ اور اس کا نام بھی بیسویں صدی ہے کہ بیوی کو آ کر سوتا ہوا پایا۔ نہ وہ پریشانی میں ٹہل رہی تھیں۔ نہ نفل پڑھ رہی تھیں نہ ان کو یہ فکر تھی کہ میاں پر کیا بیت گئی جو اب تک گھر نہیں آئے بلکہ وہ سو رہی تھیں۔ واہ ری بیسویں صدی کی رفیقۂ حیات کہ شوہر لاپتہ ہے اور بیوی خواب ناز میں ہیں، صاحب یہ سب کچھ اسی بیسویں صدی میں ممکن ہے۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چارپائی میں تھے کھٹمل، لہٰذا والد صاحب نہایت خاموشی سے اٹھ کر اندر کے کمرے میں ایک خالی چارپائی پر جا کر سو رہے۔ ادھر کھلی والدہ صاحبہ کی آنکھ اور والد صاحب کا بستر خالی پا کر۔ پہلے تو کچھ دیر خاموشی سے انتظار کیا۔ کہ شاید غسل خانے گئے ہوں۔ مگر جب زیادہ دیر ہو گئی تو اضطراب بڑھا۔ متعدد نوکر اٹھائے گئے مجھ کو اٹھایا گیا۔ کوئی ادھر دوڑا کوئی ادھر دوڑایا گیا۔ مختلف عزیزوں کے یہاں اطلاع کرائی گئی۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے۔ اتنی ہی دیر میں سینکڑوں

منتیں مرادیں مان لی گئیں اور والدہ صاحبہ کا یہ حال کہ زمین آسمان ایک کر دیا۔ دل کے دورے پڑنے لگے۔ غش پر غش آنے لگا اور بار بار صرف یہ پوچھتی تھیں کہ بچہ ملا کچھ وہ تو کہیئے کہ اس چیخ و پکار میں خود والد صاحب کی آنکھ کھل گئی اور وہ ٹہلتے ہوئے باہر تشریف لے آئے ورنہ مجھ کو بھیجا جا رہا تھا۔ ایک پڑوسی کے ساتھ تھانے پر شبیہ مبارک لکھوانے والد صاحب گئے۔"

عرض کیا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ کیا کہا ہوگا، ابی صاحب نے جن کی نیند حرام کی گئی اس طرح، میر صاحب نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کوئی کتا کیا۔ سب نے والدہ صاحبہ کی تعریف کی اور سب اس بات کے قائل ہوتے کہ بے شک شوہر کے لیے ہر بیوی کو اسی طرح پریشان ہونا چاہیئے، مگر بات کیا ہے کہ وہ تھی انیسویں صدی، جب شوہر شوہر تھا اور بیوی بیوی

عرض کیا۔ "نہیں میر صاحب تھوڑی سی ترمیم قبول کیجیے، شوہر تو بے شک شوہر تھا۔ مگر بیوی ان حالات میں یقیناً بیوی نہیں تھیں۔ صاحب یہ زیادتیاں تو آج کل آپ بیویوں کا کیا ذکر، لونڈیوں پر بھی نہیں کر سکتے۔"

میر صاحب نے کہا۔ "قطعاً نہیں کر سکتے اسی لیے تو عرض کرتا ہوں کہ یہ بیسویں صدی ہے۔ صاحب حیرت ہو گئی اس روز مجھ کو ڈپٹی صاحب کے یہاں جا کر۔ میاں لعنت ہے ایسا شوہر بننے پر اور اس سے زیادہ لعنت ہے ایسا باپ ہونے پر۔ صاحب وہ مجھ سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک تھانے دار قسم کی عورت کھٹ کھٹ کرتی

آگئی اور ڈپٹی صاحب مروتاً کھڑے ہو گئے۔ مجبوراً مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا۔ ان صاحبہ نے آتے ہی کہا:۔

"میں جا رہی ہوں آپ یہیں رہیں شاید مسز مسعود آجائیں"

ڈپٹی صاحب نے کھسیں نکال کر کہا۔ "مگر مجھے تو کلب جانا تھا وہاں ایک ضروری میٹنگ ہے۔"

ان صاحبہ نے جاتے جاتے بے پروائی سے حکم دیا۔ "کلب ٹیلیفون کر دیجیے کہ آپ نہیں آسکتے"۔

اور جب وہ چلی گئیں تو ڈپٹی صاحب نے پسپائی کے انداز سے بیٹھتے ہوئے کہا "ہماری بیوی بھی عجیب نادر شاہی احکام دیتی ہیں"۔

بھائی میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ یہ بیوی تھیں اور بہت جی چاہا کہ ڈپٹی صاحب سے کم سے کم یہ تو پوچھ ہی لوں کہ ان صاحبہ نے بحیثیت شوہر آپ کو کن داموں میں خریدا ہے یا کس تنخواہ پر ملازم رکھا ہے۔ ابھی میں بیسویں صدی کے اس کرشمے پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک سولہ سترہ سال کی لڑکا نما لڑکی ایک جھپاکے مار کر کمرے میں داخل ہوئی اور ڈپٹی صاحب کے سامنے اپنے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ صاحب وہ تھی۔ ڈلمر پر کوئی چیز۔ بال پٹوں کی صورت میں کٹے ہوئے اور سب سے بڑی چیز تو پتلون۔ لڑکی اور پتلون۔ خیر صاحب اس لونڈیا نے ڈپٹی صاحب کو ڈانٹنا شروع کیا۔ "ڈیڈی اب تک آپ یہاں ہی بیٹھے ہیں آپ سے میں کہہ چکی تھی کہ مجھے چار بجے جانا ہے مگر آپ تو میری ہر

بات بھول جاتے ہیں۔ اب اُٹھیے فوراً"

ڈپٹی صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "گڈ ڈارلنگ تمہاری ممی مجھ کو قید کر گئی ہیں کہ شاید مسٹر مسعود آتی ہوں میں ان کا انتظار کروں۔"

اُس لڑکی نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔ "یہ انتظار بیرا بھی کر سکتا ہے، خانساماں بھی کر سکتا ہے۔ آپ فوراً تیار ہو جائیے"۔

ڈپٹی صاحب نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھ کو اس وقت کلب بھی جانا تھا مگر تمہاری ممی کے حکم کی تعمیل میں بیٹھا ہوں۔"

لڑکی نے بُرا مان کر کہا: "اچھا تو آپ بس ان ہی کا حکم مان سکتے ہیں۔ میری کوئی پروا نہیں۔"

ارے جناب اس لونڈیا کا یہ کہنا تھا کہ ڈپٹی صاحب ایک دم کھڑے ہو گئے اور ملازم کو بلا کر کہا کہ مسٹر مسعود کا انتظار کرو، میں بے بی کے ساتھ جا رہا ہوں ابھی واپس آتا ہوں۔ صاحب میری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں نے دل ہی دل میں کہا کہ واہ ری بیسویں صدی۔ بندہ نواز مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ میری بہن مجھ سے اور والد صاحب سے ایک قسم کا گویا کانا پردہ کرنے لگی تھیں کیا مجال کہ ہم لوگوں کی موجودگی میں دوپٹہ سر سے سرک تو جائے یا گردن اٹھا کر آنکھ چار تو کر لیں۔ آپ کو یقین نہ آئے گا کہ مجھ کو یہ نہیں معلوم کہ میری بہن کی آواز کیسی تھی ہم لوگوں سے تفصیلی بات کرنا تو در کنار مشکل تمام بڑی سے بڑی بات کا جواب ہاں اور نہیں کے سوا اُن سے کچھ اور نہ سُنا۔ بھائی جان اس کا

پتہ ہی بمشکل چلتا تھا کہ اس گھر میں وہ بھی ہیں۔ مگر ہماری میری بہن فخر ہے مجھ کو اُس پر ایک نکاح نامہ تو ایسا ہے اُس کا کہ اب ذرا سے لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ بھائی صاحب شادی ہوتی اُس کی دلہن بنائی گئی وہ آج کل کی دلہنوں کی طرح نہیں کہ ٹھسکے سے بیٹھتے ہیں وہ دن بھی گھونگھٹ کا بار نہیں اٹھتا حضرت۔ لجھے بیٹھی ایک کوٹھری میں اور اب جناب غشی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ بمشکل تمام پتہ چلا کہ ایک سیاہ رنگ کا اُنگل بھر موٹا بالشت بھر لمبا کنکھجورا شانے میں پیوست ہے دلہن لجائے کیسے اور بتائے کیسے کہ کنکھجورا چمٹا ہوا ہے۔"

ہم نے کہا: "لاحول ولا قوۃ۔ اور آپ اس شرم پر فخر کر رہے ہیں۔"

میر صاحب نے کہا: "بندہ نواز اس شرم کی اہمیت اس بیسویں صدی میں آپ کیا سمجھ سکتے ہیں اُس وقت تو دھوم تھی اس بات کی اور جو سنتا تھا عش عش کر اٹھتا تھا آج کل کی طرح نہیں کہ عباسی صاحب کے یہاں سے دعوتِ ولیمہ کا رقعہ آیا تھا میں بھی گیا وہاں اے بھائی دیکھتا کیا ہوں کہ دروازے ہی پر دولہا اور دلہن دونوں مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔ جی ہاں دلہن بھی حضرت یہ بیسویں صدی عجیب عجیب تماشے دکھا رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عباسی صاحب اُس خاندان سے ہیں جس میں مستورات اگر بیمار ہوتی تھیں تو نبض پر ڈوری باندھ کر اس کا ایک سرا طبیب کو دیا جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ مریضہ کی کلائی ایک نامحرم کے ہاتھ میں تھما دی جائے مگر اب ان ہی عباسی صاحب کے صاحبزادے ایک دن کی بیاہی دلہن کو منہ بھاڑ کر ہر چار

دروازے پر پہنچ کر ٹھٹھکے میں اور بھائی سے ہاتھ ملوا رہے ہیں صاحب میری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کھانا ختم ہو چکا تھا لہٰذا حسب دستور عرض کیا۔ میر صاحب اب تشریف لے چلیے گھر تاکہ بھابی سے صفائی کرائی جائے۔"

کچھ اور برہم ہو کر بولے: "حضرت ہمیشہ آپ کا کہنا مانا ہے مگر اس مرتبہ دل میں ایسی گرہ پڑی ہے کہ اب نہ کھل سکے گی۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ان کو معلوم ہے کہ میں اس بیسویں صدی کے شوہروں میں سے نہیں ہوں جو بیویوں کے کوٹ کاندھے پر لے کر آگے آگے بیوی اور پیچھے پیچھے میاں پارٹیوں میں جاتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ میں خدا کے فضل سے اُنیسویں صدی کی یادگار ہوں۔ میرے کھانے کا وقت اور وہ حمام فرما رہی ہیں۔ اس زمانے میں شوہر کی یہی قدر رہ گئی ہے۔ مجازی خدا کا اب یہی درجہ رہ گیا ہے اور اگر یہی وقعت عزت اور احترام رہ گیا ہے تو لعنت ہے اس زندگی پر۔"

عرض کیا: "میر صاحب آپ بے وجہ روٹھتے ہیں۔ وہ روز میرے کہنے سے نہاتی ہیں اور میں بے وجہ بیچ میں پڑتا ہوں اُنیسویں صدی کی اس وضع میں تو فرق پیدا نہ ہونے دیجیے۔"

میر صاحب اب ذرا دھیمے پڑے۔ بس اسی وضعداری نے مجبور کر رکھا ہے کہ نباہ ہو رہا ہے ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی بھابی نے بھی بیسویں صدی کے رنگ دکھانا شروع کر دیے ہیں۔ حضرت میں ایک شرط پر چلتا ہوں کہ ان کو ذرا

اچھی طرح سمجھا دیجئے۔ کہ میں ان بشیرن صدری کے شوہروں میں سے نہیں ہوں کہ زبانی مرثیے کرنے لگوں اور یہ بھی کہہ دیجئے گا کہ یہ آخری موقع ہے کہ میں درگذر سے کام لے رہا ہوں۔"

میر صاحب کوسے کر اُن کے گھر گئے۔ دروازے پر آواز دی اور بھابی بیچاری کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ ع

لگے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔

وہ خاموشی سے سنتی رہیں جواب دے ہی نہ سکتی تھیں اس لیے کہ آواز کا بھی پردہ تھا البتہ میر صاحب گھر ہی گئے ہیں تو اُن کی آواز صاف سنائی دیتی تھی جس میں ہر سانس کے ساتھ بشیرن صدری کا نام تھا اُن کی زبان پر۔

سفارش

سفارش شروع شروع میں تو بری نہیں لگتی جب مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس پر اپنے اثر و رسوخ کا سکہ بٹھایا جائے اور اہل محلہ کو یہ پتہ چلے کہ ان کے محلے میں ایک پہنچا ہوا شخص بھی رہتا ہے جو مشکل میں ان کے کام آسکتا ہے مگر جب تک اہل محلہ کو یہ اندازہ ہو تو بات یہاں تک پہونچ جاتی ہے کہ سفارشوں کی کثرت ان پہنچے ہوئے بزرگ کو امرت دھارا بنا کر رکھ دیتی ہے کسی کو اپنا تبادلہ کرانا ہے منہ اٹھائے ہوئے چلے آرہے ہیں کسی نے رشوت لے لی ہے اور پکڑے گئے ہیں تو اب صرف اتنی سفارش چاہتے ہیں کہ برطرف کر دیئے جائیں مگر جیل کی طرف روانہ نہ کیے جائیں۔ امتحان دیا ہے اور ممتحن کی نااہلی یا صوبجاتی تعصب سے ناکامی کا اندیشہ ہے اپنی فلاں بیوی کی ذرا سی ناک کاٹ لی ہے اور اس خبر کو محلے میں ایسی خواہ مخواہ بھانڈا پیٹتی ہے۔ اقتصادی مجبوری کے ماتحت جعلی چیک بنانے کی کوشش کی ہے اور وہ

چلے گئے ہیں۔ بغیر نقشہ منظور کرائے مکان بنالیا ہے اور اب وہ گرایا جا رہا ہے۔ مجھ پر روٹھ کر ہندوستان چلی گئی ہے لہٰذا اس کو منانے کے لیے جانا ہے اور پرمٹ کی شدید ضرورت ہے۔ صاحبزادے نے اپنی جگہ کسی اور کو امتحان دینے کے لیے بٹھا دیا تھا...... ....

جس کا پتہ خدا جانے کیسے چل گیا ہے اور اب دونوں لڑکوں کا رسٹیکیشن ہو رہا ہے۔ ایک عورت ایک بیچارے معصوم لڑکے کو بھگا لائی ہے اور معصوم لڑکے پر اغوا کا مقدمہ چل رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر روز عجیب عجیب قسم کی سفارشوں کے لیے جب لوگ گھیرنا شروع کردیں اور اپنی بداخلاقی کے سلسلے میں بااخلاقی دباؤ ڈالیں تو یہی شوق ایک مستقل عذاب بن کر رہ جاتا ہے اور ضمیر کی آواز بلند ہونا شروع ہوتی ہے کہ اے مجرموں کے معاون تو بھی مجرم ہے چنانچہ پہلے تو بہانے تراشے جاتے ہیں۔ جھوٹ کے پُل باندھے جاتے ہیں۔ لنگڑے عذر اور لولی معذرتیں کی جاتی ہیں اور آخر کار وہ آزمودہ نسخہ نکالا جاتا ہے جو بڑے لوگوں میں مدت سے متداول ہے۔ یعنی سفارشی خطوط چلتے ہیں اہلِ معاملہ کا دل رکھنے کو ایک سفارشی خط دے دیا اور ادھر وہ روانہ ہوا اُدھر اُن صاحب کو جن کے نام خط ہے ٹیلیفون کردیا کہ بھئی میرا خط لے کر ایک صاحب آرہے ہیں۔ مروت میں خط تو لکھ دیا ہے مگر یہ حضرت ہیں حرفوں کے بنے ہوئے میرے خط کی پروا نہ کرنا جو مناسب سمجھنا وہی کرنا مجھے قطعاً کوئی شکایت نہ ہوگی۔ بلکہ بعض بڑے لوگ آپس میں یہ طے کرلیتے ہیں کہ سفارشی خط تو اس لیے لکھے جاتے ہیں کہ اپنا ووٹ یا اپنا گاہک یا اپنا

موکل یا اپنا پڑوسی ذرا خوش ہو جائے گا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس خط کی تعمیل بھی ہو۔ یہ طریقہ بہت مجرب ثابت ہوا ہے۔ اس سے خوش خواہ کوئی نہ ہو مگر شکایت کا موقع بھی آسانی سے نہیں مل سکتا۔

یہ سب تو خیر بہت پرانے طریقے ہیں میں نے ایک عجیب و غریب طریقہ نکالا کہ شاید کوئی صاحب تشریف لائے۔ اپنی شان میں ان کا قصیدہ سنا اور معلوم ہوا کہ میں کسٹم رس رحاصب رسوخ اور باثر انسان ہوں۔ پتہ چلا کہ میں اہلِ محلہ کی نگاہوں میں گویا فرشتہ رحمت واقع ہوا ہوں اور جب اس قصیدے کا گریز شروع ہوا ——— کہ صاحب ایک عجیب مصیبت پڑ گئی ہے کہ میں جس مکان میں رہتا ہوں اب اس کا کرایہ طلب کیا جا رہا ہے۔ مجھ سے بھلا غور تو کیجئے کہ میں نرا مہاجر مجھ کو اور کوئی مدد دینے کی بجائے مکان کا کرایہ مانگا جا رہا ہے۔

نہایت ہمدردی سے پوچھا۔ عجیب بات ہے اور انتہائی زبردستی ہے۔ ایک تو آپ نے ایک خالی مکان کو آباد کیا اوپر سے تقاضہ ہے آپ ہی سے کہ مکان کا کرایہ بھی دیں میں ضرور اس بے انصافی کے خلاف الفاظ کی پوری قوت کے ساتھ احتجاج کروں گا۔ مگر اس کے لیے مجھے کس کے پاس جانا چاہیے۔

وہ حضرت خوش ہو کر بولے ”اگر آپ ڈی۔ آر۔ سی کے پاس ذرا چلے جائیں تو یہ قصہ آج ہی ختم ہو سکتا ہے۔“

بڑی معصومیت سے پوچھا کون ڈی۔ آر۔ سی

ملاحظہ ہو سے "جانتے ہو گے آپ میر منصب علی۔

ایک دم گویا چونک کر نہایت تشویش سے کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ان کے پاس بھلا میں کیسے جا سکتا ہوں۔ اس قدر تعلقات خراب ہیں کہ اگر میں چلا بھی جاؤں تو سفارش کا اُلٹا اثر ہو گا اُن سے تو میرا نام بھی نہ لیجیے گا ورنہ کرایہ کی ادائیگی کے لیے جو مہلت دی ہے وہ بھی واپس لے لیں گے۔ آگ ہی تو لگ جاتی ہے۔ میرا نام سن کر وہ تو صاحب میرے خون کے پیاسے ہیں۔ مارپیٹ ہوتے ہوتے بچی ہے ایک دن"۔

اب اس کے بعد ظاہر ہے کہ وہ حضرت مزید اصرار نہیں کر سکتے جس نے جس کا نام لے کر لیا کہ اُن حضرت سے یہ کام ہے۔ فوراً ایک شدید قسم کی رنجش تصنیف کر دی اور یہ قصہ جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں ختم کر دیا۔ اس طریقے سے بہت دن مزے اڑائے اور سفارشوں سے جان بچتی رہی مگر حال ہی میں ایک ایسا واقعہ پیش آگیا ہے کہ میں خود اس کو رفع دفع کرنے کے لیے کسی سفارش کی تلاش میں ہوں۔

محلے میں ایک خانصاحب رہتے ہیں جو زندگی مجسم ہیں اور اسی جسم کی نمائش کے جتنے طریقے ہو سکتے ہیں اُن کے بدلے کام لیتے ہیں مونچھوں پر نہایت خوفناک قسم کا تاؤ دیتے ہیں اور مونچھوں سے زیادہ خود اینٹھے رہتے ہیں شورہ پشت اس قیامت کے کہ آج اس کو مار دیا کل اُس سے فوجداری کر لی چاقو اور چھرے سے تو ادھر بات ہی نہیں کرتے حال ہی میں شہر کے مختلف محلوں میں سے چن چن کر غنڈے جو گرفتار کیے گئے تو خانصاحب کو پتہ چلا کہ اس فہرست میں ان کا نام نامی اسم گرامی بھی ہے اور بس آج ہی کل میں گرفتاری ہونے والی ہے۔ چنانچہ ایک دن صبح ہی صبح دروازے پر ڈنڈا

برسانا شروع کر دیا دروازہ کھول کر دیکھا تو خانصاحب۔ روح پرواز کر گئی الٰہی خیر ہو
ملک الموت نے آج کہاں گھر دیکھ لیا۔ جلدی سے گھبرا کر عرض کیا۔ السلام علیکم خان صاحب
یہ آج کدھر راستہ بھول گئے۔

خانصاحب جھومتے ہوئے کمرے میں آ گئے اور حسب معمول ایک پتھر سا کھینچ مارا۔
ان کو جانتے ہو اس علاقے کے بڑے تھانیدار کو:

عرض کرنا چاہتے تھے کہ شدید مخالفت ہے۔ مگر خانصاحب سے مرعوب ہو کر
ہکلا کر رہ گئے اور بجائے جھوٹ بولنے کے پوچھا خیریت تو ہے قصہ کیا ہے آخر۔

صوفے پر بیٹھ کر جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا ہی تھا کہ میں نے سگریٹ پیش کر دی
مگر سگریٹ کو رد کرتے ہوئے رکھائی سے بولے۔ قسم قرآن کی آنتیں نکال کر ڈھیر کر دوں گا
سڑک پر۔

خون خشک ہو گیا اور زبردستی مسکرا کر پوچھنا پڑا کس کی آنتیں خان صاحب کچھ
بتائیے تو سہی بات کیا ہے آخر۔

مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ میرا نام غنڈوں کی فہرست میں لکھا ہے اور اب مجھے
گرفتار کرنا چاہتے ہیں — عرض کیا۔ اجی لاحول ولا قوۃ۔

کہنے لگے جانتے ہو ان کو فوراً کہہ دینا کہ میرا اس فہرست سے نام نکال دیں۔
مگر آج ہی کہہ دینا

کبھی وہ چلے آئیں ہتھکڑی لے کر اور خواہ مخواہ خون خرابہ ہو۔

اب میں نے حواس بجا کر کے عرض کیا۔ مگر آپ کو معلوم نہیں خانصاحب کو میرے اور اُن کے تعلقات تو بہت ہی کشیدہ ہیں ایک سفارش کی تھی وہ نہیں مانے تو میں۔۔۔

خانصاحب نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ مگر پرسوں تو تم ان کے ساتھ جا رہے تھے" جلدی سے کہا "پرسوں سہ پہر کو اسی شام کا تو یہ قصہ ہے اور اس کے بعد سے علیک سلیک سب بند ہے۔ بڑا نفسی آدمی ہے۔ اگر آپ کے متعلق اس سے بات بھی کی تو میرا بدلہ آپ سے لے گا۔ ورنہ میں حاضر تھا۔

خانصاحب نے غور سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا معلوم ہوتا ہے سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے گا۔ خیر دیکھ لوں گا میں بھی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر خریدا ہے تھانیدار نے" اور یہ کہہ کر خانصاحب تو مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے نکل گئے مگر مجھ کو سخت پریشان کر گئے بات یہ ہے کہ جن بیچارے تھانیدار کے متعلق وہ یہ سب کچھ فرما رہے تھے، وہ نہایت ہی نیک نفس اور دیانتدار آدمی ہے، اور اپنا دوست بھی ہے ظاہر ہے کہ اب میرا سب سے پہلا فرض تھا کہ تھانیدار صاحب کو خان کے ارادوں سے مطلع کرتا کہ ذرا ہوشیار رہیں مگر اندیشہ تھا کہ اگر خان صاحب کو پتہ چل گیا تو خدا جانے میرا کیا حشر کریں۔ مجھے اپنی بزدلی کا اعتراف ہے کہ میں تھانیدار صاحب کے پاس نہیں گیا۔ اور ان کی جان سے اپنی جان زیادہ قیمتی سمجھی۔ مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ شامت اچانک ہی کسی دروازے سے آ جاتی ہے۔ چنانچہ خلاف توقع تھانیدار صاحب خود آ موجود ہوئے بعد اب جو میں باہر آتا ہوں تو وہ حسب معمول بے تکلفی سے گلے میں بانہیں ڈال کر بولے۔

چھٹی کی منظوری آگئی ہے اور میں آج ہی جا رہا ہوں گھر۔

میں نے جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھا مگر شکر ہے کہ خانصاحب اُس پاس نہ تھے پھر بھی احتیاطاً تھانیدار صاحب کو کمرے میں لا کر میں نے کہا۔ بھئی وہ جو ہیں نا۔ خانصاحب

تھانیدار نے بات کاٹ کر کہا۔ کون ! وہ ۔ ملا بستانی تو نہیں۔

میں نے کہا۔ ہاں وہی۔ ان کا کیا قصہ ہے۔

تھانیدار صاحب نے کہا۔ قصہ یہ ہے کہ وہ سرکاری مہمان بننے والے ہیں اوپر سے شہر کے خطرناک غنڈوں کی جو فہرست آئی ہے۔ اس میں ان کا نام بھی ہے۔ رخصت سے واپس آکر ان کو سرکاری دعوت نامہ پہنچا کر پہنچا دوں گا مہمان خانے میں۔

میں نے نہایت رازداری کے ساتھ خانصاحب کی تمام گفتگو دہرا دی تو تھانیدار صاحب نے نہایت بے پروائی سے ہنستے ہوئے کہا۔ کیا کروں چھٹی لے چکا ہوں ورنہ آج ہی مزاج پوچھ لیتا۔ بہرحال بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ واپسی پر سہی"۔

میں نے کہا۔ مگر بھائی وہ تو نہایت خطرناک آدمی ہے ذرا ہاتھ پیر بچائے ہوئے

تھانیدار صاحب نے اسی استغنا سے کہا۔ لاحول ولا قوۃ ایسے غنڈوں کو خاطر میں لانے لگیں تو وردی میں چوڑیوں کا اضافہ بھی کرالیں۔ اسی شیر کو چوہے کی طرح سلاخوں کے اس پار دکھاؤں گا ذرا چھٹی سے واپس آنے دو چند دن کی تو بات ہے انشاءاللہ

تک اور مونچھوں پر تاؤ دے لیتے ہوں تو نہایت ہی جرائم پیشہ غنڈہ ہے مگر اب تک پولیس کے قبضے میں نہیں آیا۔

تھانیدار صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ شکر ہے کہ خانصاحب کو خبر نہیں ہوئی ورنہ ان سے جو جھوٹ بولا ہے اس کی قلعی کھل جاتی۔

دوسرے دن دروازے پر پھر وہی ڈنڈا برسا اور خانصاحب اسی ٹھاٹھ کے ساتھ پھر کمرے میں نازل ہوئے۔ میں حسبِ معمول پھر نیازمندانہ اُن سے ملا مگر خانصاحب نے آج بھی سگریٹ قبول نہ فرمائی اور بیڑی کا کش لیتے ہوئے بولے۔ ملاقات تو نہیں ہوئی تھانیدار سے"

عرض کیا میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ملاقات ہونا کیا معنی علیک سلیک بند ہے بالکل ہی کو اپنی تھانیداری پر ناز ہے تو میں بھی ذرا ضدی آدمی ہوں۔

خان صاحب نے گھورتے ہوئے کہا۔ اسی کا نام ہے محلہ داری میں نے خود دیکھا ہے کل اپنی آنکھوں سے سامنے والے مکان کی کھڑکی سے میں سب کچھ دیکھ رہا تھا تھانیدار تمہارے پاس آیا۔ تم اس سے ملے۔ اُس نے تم کو گلے سے لگایا تم نے اس سے ہاتھ ملایا پھر تم اس کو اسی کمرے میں لے آئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں آئیں۔ دیر تک وہ تمہارے پاس بیٹھا اور تم کہتے ہو کہ علیک سلیک بند ہے۔

میں گھبرا گھبرا کر خدا جانے کیا کیا کہتا رہا اور خان صاحب برابر آنکھوں سے خون اور مونچھوں سے چنگاریاں برساتے ہوئے کہتے رہے میں سمجھا تھا کہ ہمسایہ ہے پڑوسی ہے اپنے

کام آؤ گے۔ مگر تم خود خفیہ پولیس ہو تم پولیس کے ٹٹو ہو۔ یہ سب ملی بھگت ہے۔ مجھ کو بھی کیا تم نے لونڈا سمجھ رکھا ہے کہ صاف جھوٹ بول گئے۔"

میں نے کہا خانصاحب آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر میں نے آپ کی سفارش کی تھی خانصاحب نے گرج کر کہا۔ سفارش کی تھی تم نے یہ چکمہ دو کسی اور کو۔ مگر سفارش کریں گے تمہارے فرشتے مجھ کو بھی دلاور خان نہیں چمار کہنا۔ اگر تم ہی سے سفارش نہ کرائی ہو۔ میرا کیا ہے مجھے تو جیل جانا ہی ہے پھر ایک آدھ کی آنتیں کیوں نہ ڈھیر کر کے جاؤں۔ دنیا میں رہ کر تم نے بھی مگر مچھ سے بیر کیا ہے۔

اب میں نے واقعی نہایت ذلیل قسم کی خوشامد شروع کر دی۔ بخدا یہ بات نہیں آپ کے سر عزیز کی قسم خانصاحب طوفان بن کر اٹھے اور دروازہ اس زور سے کھولا کہ بے غیرت تھا ورنہ ٹوٹ جاتا۔ دروازے کے باہر نکل کر ایک بار پھر پلٹے اور کڑک کر کہا۔ مجھے دیکھنا ہے کہ تم اس تھانیدار کے بوتے پر اس محلے میں کیسے رہتے رہو۔ دلاور خان پٹھان کی اولاد نہیں اگر ایک آدھ کی آنتیں نہ ڈھیر کر کے دیکھ لوں گا میں تم کو۔ اور دیکھ لینا تم بھی مجھ کو۔"

خانصاحب کے جانے کے بعد جب اختلاج کا دورہ ختم ہوا اور دل ذرا ٹھہرا تو در و دیوار کو گواہ کر کے اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ میں خانصاحب کی سفارش ضرور کروں گا۔ تھانیدار صاحب واپس آ جائیں تو سفارش ہی نہیں بلکہ اُن سے زبردستی بھی کروں گا۔ مگر اس وقت کے لیے کوئی اللہ کا بندہ خانصاحب سے

میری سفارش کر دے کہ وہ مجھ پر رحم کھائیں میرے معصوم بچوں پر رحم کھائیں۔ اب میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ مجھ کو رہ رہ کر اپنی آنتوں کا ڈھیر اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آتا ہے وہ اختلاج کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ ہے کوئی جو خانصاحب سے میری سفارش کر دے!
